"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا..... میں ان کے لیے انھی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔"

قرآن مجید میں اس عہد کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے رحمت کی جو دعا کی، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۱۵۶-۱۵۷ اعراف)

اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔ میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے ـــ یعنی جو پیروی کرتے ہیں رسول نبی امی کی جن کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں۔ وہ ان کو حکم دیتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں منکر سے اور ان کے لیے جائز کرتے ہیں پاکیزہ چیزیں اور حرام کرتے ہیں ان پر ناپاک چیزیں اور رفع کرتے ہیں ان پر سے بوجھ اور پھندوں کو جو ان پر تھے۔ پس جو ان پر ایمان لائے اور جنھوں نے ان کی حمایت کی اور مدد دی اور اس روشنی کی پیروی کی جو ان کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بنی اسرائیل سے جو عہد اللہ تعالیٰ نے لیا تھا اس میں بنی اسرائیل پر کیا ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے کیا وعدے کیے گئے تھے۔

رہبت کا مفہوم

وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ، کسی کی عظمت وجلالت کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی کی حالت طاری ہو جاتی ہے اس کے لیے عربی زبان میں رہبت کا لفظ ہے اور یہ بات إِيَّاكَ نَعْبُدُ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں کہ اگر فعل کے مفعول یا اس کے متعلق کو فعل پر مقدم کر دیا جائے تو یہ اس کے اہتمام اور اس پر زور دینے کی ایک شکل ہوتی ہے۔ علاوہ بریں اگر فعل پر ف آ جائے تو یہ مزید اہتمام کی ایک دلیل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر فعل کے بعد ضمیر بھی آ جائے تو اسی پہلو کی مزید وضاحت ہو گی۔ اس لحاظ سے وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ کے معنی ہوں گے پس صرف مجھی سے ڈرو۔

صرف مجھی سے ڈرو کا مطلب یہاں یہ ہے کہ میرے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تمہاری دوسری مصلحتوں اور دوسرے اندیشوں پر میری عظمت وجلالت کے تصور کو غالب ہونا چاہیئے۔ تم ڈرتے ہو کہ اگر تم نے نبی آخرالزمان کی دعوت قبول کرلی تو تمہاری سیادت وریاست ختم ہوجائے گی، امیوں کو تم پر فضیلت حاصل ہوجائے گی، تمہارے عوام تمہارے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور جو فوائد تم ان سے اب تک حاصل کرتے رہے ہو ان کے دروازے بند ہوجائیں گے حالاں کہ ڈرنے کی چیزیں یہ نہیں ہیں۔ ڈرنا تو صرف مجھ سے چاہیئے جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے اور جس نے تم سے عہد لیتے وقت پہاڑ کو تمہارے سروں پر چھتری کی طرح اوڑھا دیا تھا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ (۴۱)

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کا اصل مفہوم

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ، مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس چیز کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے۔ یعنی قرآن مجید اس پیشین گوئی کو سچی ثابت کر رہا ہے جو تورات میں آخری نبی کی بعثت اور اس بعثت کی خصوصیات سے متعلق وارد تھی۔ مقصود یہ ہے کہ اگر سمجھ سے کام لو تو قرآن مجید اور یہ پیغمبر تمہارے لیے چڑنے کی چیز نہیں ہیں بلکہ سر اور آنکھوں پر بٹھانے کی چیز ہیں کیوں کہ ان کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا ہی سر بلند ہوا ہے۔ تمہارے صحیفوں میں ان کی پیشین گوئیاں موجود تھیں اور یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر کے ظہور نے ان کا مصداق دنیا کے سامنے پیش کر کے تمہاری کتاب کو سندِ تصدیق عطا کر دی تو تمہیں تو سب سے پہلے اس پر ایمان لانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیئے۔

اس تصدیق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں تک تورات یا انجیل کے آسمانی صحیفے ہونے کا تعلق ہے قرآن مجید آشکارا طور پر ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے، ان کے لانے والوں کی نبوت و رسالت کی بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں تصدیق کرتا ہے، ان کی تعلیمات کی بھی اصولی طور پر تصدیق کرتا ہے۔ قرآن اگر تردید کرتا ہے تو صرف ان چیزوں کی تردید کرتا ہے جو غلط طریقوں سے ان صحیفوں میں شامل کر دی گئی ہیں یا تحریف کر کے جن کی اصلی شکل بگاڑ دی گئی ہے۔ اس طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک اصل تورات کا تعلق ہے، قرآن مجید اس کی سچائی کا گواہ بن کر نازل ہوا ہے، وہ اس کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان چیزوں سے اس کو بری قرار دیتا ہے جو اس کو جھٹلانے والی ہیں۔

زبان کا ایک نکتہ

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ: اَفْعَل کا مضاف الیہ اگر نکرہ مفرد ہو تو وہ تمیز کے مفہوم میں ہوا کرتا ہے لیکن اگر اس کی اضافت معرفہ کی طرف ہو تو اس شکل میں مضاف الیہ جمع ہوگا۔ مثلاً قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ (۸۱۔ زخرف) (کہہ دو، اگر خدا کے کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوں)۔

اَوَّلَ کَافِرٍ اور اَوَّلَ الکٰفِرِیۡنَ دونوں کے مواقع استعمال میں، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ایک لطیف فرق بتاتے ہیں۔ جب اَوَّلَ کَافِرٍ کا استعمال ہوگا تو اس میں اس سے بحث نہیں ہوگی کہ اس کے علاوہ کوئی اور کافر پایا جاتا ہے یا نہیں اور دوسری شکل میں مفہوم یہ ہوگا کہ وہ کفر کرنے والوں میں سب سے پہلا شخص ہے۔

"کفر" کا لفظ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں حق کے انکار کے معنی میں بھی آتا ہے اور کفرانِ نعمت کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ لفظ دونوں ہی مفہوموں پر حاوی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ قرآن پر ایمان لانے کا ان سے عہد لیا جا چکا تھا اس وجہ سے اس کا حق ہونا ان پر اچھی طرح واضح تھا، اس بنا پر یہ ایک عظیم حق کا انکار ہوا۔ پھر قرآن مجید ان کے لیے ایک بہت بڑی نعمت بن کر نازل ہوا تھا، اس پر ایمان لانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے ابدی نعمتوں کے وعدے تھے، اس وجہ سے اس سے اعراض درحقیقت ایک بہت بڑا کفرانِ نعمت بھی تھا۔

"سب سے پہلے اس کے کفر کرنے والے نہ بنو" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب دوسرے کفر کرلیں تو تمھارے لیے کفر کرنا جائز ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ قرآن تمھاری کتاب کی تصدیق کرتا نازل ہوا ہے اور اس پر ایمان لانے کا تم سے اس کے نزول سے پہلے ہی عہد لیا جا چکا ہے اس وجہ سے اس کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی سب سے پہلے تم ہی سے توقع کی جا سکتی تھی لیکن یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ دوسرے تو اس سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے کے لیے سبقت کریں اور تم اس سے پہلے سے آشنا ہو کر اس کی مخالفت کی راہ میں سبقت کرو۔

نہی کے ساتھ قید کا فائدہ

اس طرح کے مواقع پر نہی کے ساتھ جو قید لگی ہوئی ہوتی ہے استاذ امامؒ کے نزدیک اس کا مقصود محض صورتِ واقعہ کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، نہی کا اصل تعلق تو فعل سے ہوتا ہے، قید اس کے ساتھ محض اس لیے بڑھا دی جاتی ہے تاکہ وہ صورتِ حال سامنے آجائے جو اس کے ارتکاب میں مضمر ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۱۳۰۔ آل عمران) سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا کرتے ہوئے۔

اس آیت میں مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر سود در سود کی شکل پیدا نہ ہو تو سود مباح ہے بلکہ مقصود اس صورتِ حال کے پیش کرنے سے اصل فعل کی نفرت انگیز شکل کو سامنے کر دینا ہے۔

اسی طرح زیر بحث ٹکڑے کے بعد فرمایا، وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور میری آیتوں کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو) تو اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ اگر اچھے دام مل جائیں تو بیچ سکتے ہو، بلکہ نہی کا تعلق یہاں بھی اصل فعل سے ہے، یعنی روکا جس چیز سے گیا ہے وہ دین فروشی ہے، لیکن ثَمَنًا قَلِيْلًا کی قید نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ دین فروشی کا یہ کاروبار نہایت ذلیل طریقہ سے ہو رہا ہے کیوں کہ اللہ

کی آیات کے بدلے میں اگر تمام دنیا بھی حاصل ہو جائے تو وہ بہرحال ایک متاع حقیر ہی ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن کے انکار میں یہود سے پہلے تو قریش نے سبقت کی تو قرآن نے سبقت کا الزام یہود پر کیوں عائد کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یہاں یہود سے بہ حیثیت قوم کے کہی جا رہی ہے اور مقابل میں یہاں امی عرب بہ حیثیت قوم کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ عدنانی ہیں یا قحطانی۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قریش نے قرآن کا انکار کرنے میں سبقت کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انصار نے اس کے قبول کرنے میں سبقت کی۔ پھر قریش کے انکار کی نوعیت بھی بہرحال یہ نہیں تھی کہ سارا قریش اس کے انکار ہی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہو۔ ان میں قرآن کے انکار کرنے والے بھی تھے اور قرآن پر جان نثار کرنے والے بھی تھے، لیکن بنی اسرائیل کا حال اس سے بالکل مختلف تھا، یہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور مخالفت کے لیے من حیث القوم اٹھ کھڑے ہوئے اور آخر دم تک اس مخالفت پر اڑے رہے۔ درآنحالیکہ دینِ الٰہی کے وارث اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں کے امین ہونے کے سبب سے امی عربوں کے مقابل میں ان کو اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ کا درجہ حاصل کرنا تھا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ، میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو، یعنی اپنے دنیوی مفادات و مصالح پر تورات اور اس کے احکام و ہدایات کو قربان نہ کرو۔ یہ ایک جامع اسلوب بیان ہے جس میں یہود کی ان تمام عہد شکنیوں کی طرف اشارہ ہو گیا ہے جن کے وہ مرتکب ہوئے تھے اور جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آ رہی ہے۔ یہود سے اللہ تعالیٰ نے جو عہد لیا تھا اس میں تین چیزیں خاص طور پر بہت نمایاں تھیں، ایک یہ کہ وہ تورات کی شریعت پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں گے، دوسری یہ کہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے جو ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہو گا۔ جو تورات میں موجود ہیں، تیسری یہ کہ ان کو جو کتاب عطا ہوئی ہے خلق کے سامنے اس کی شہادت دیں گے، اس کے کسی جزو کو چھپائیں گے نہیں۔

یہاں جب فرمایا کہ میری آیتوں کو حقیر معاوضے کے عوض نہ بیچو تو دوسرے الفاظ میں گویا یہ فرمایا کہ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر ان تمام عہود کو خاک میں نہ ملاؤ جو تم خدا سے کر چکے ہو۔

نقضِ عہد کی تعبیر کے لیے ایک اسلوب

نقضِ عہد کے مفہوم کو تعبیر کرنے کے لیے قرآن مجید نے یہ اسلوب دوسرے مقامات میں بھی استعمال کیا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا	ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے وہ انبیا جنھوں نے خدا کی فرمانبرداری کی اور ربّانیوں اور علما نے بھی اسی کے مطابق فیصلے کیے کیوں کہ وہ کتاب الٰہی کے امین بنائے گئے

تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۴۴۔ مائدہ ۷)

تھے اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے تو تم لوگوں سے نہ ڈرو، صرف مجھی سے ڈرو۔ اور میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کیا تو وہی لوگ کافر ہیں۔

اس آیت میں لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا کے موقع و محل کو دیکھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اللہ کے عہد کو، جو اس نے تورات میں تم سے لیا ہے نہ توڑو، یہ مفادات تمھاری نگاہوں میں کتنی ہی اہمیت رکھنے والے ہوں لیکن خدا کے عہد و پیمان اور اس کے احکام و آیات کے بالمقابل بالکل ہی ہیچ ہیں۔

اس ٹکڑے کے مخاطب یہود کے عوام بھی ہیں اور خواص بھی۔ عوام اس وجہ سے کہ وہ اگرچہ بظاہر تورات کو مانتے تھے لیکن ان کی ساری دینداری محض رسمی و رواجی تھی، اصل شریعت انھوں نے اپنی خواہشاتِ نفس پر قربان کر دی تھی۔ خواص اس وجہ سے کہ ان کے صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں انھوں نے ان پر یا تو تاویل کے پردے ڈال دیئے تھے یا ان پر تحریف کی قینچی چلا دی تھی اور محرک اس تاویل و تحریف کی دو چیزیں تھیں۔ ایک بنی اسماعیل کے خلاف حسد کا جذبہ دوسری اس بات کا خوف کہ اگر اصل حقیقت ظاہر کر دی تو عوام بگڑ کھڑے ہوں گے اور جو عزت و سرداری اس وقت ان کو حاصل ہے وہ خطرے میں پڑ جائے گی۔

رہبت، تقویٰ اور خشوع ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں

وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ: اتقا اور تقویٰ کی تحقیق ہم ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں۔ اوپر والی آیت میں وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ فرمایا تھا۔ یہاں وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ فرمایا۔ پھر آگے کی ایک آیت میں خشوع کا لفظ آ رہا ہے۔ رہبت، تقویٰ، خشوع سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ کسی کے عظمت و جلال کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی طاری ہوتی ہے وہ رہبت ہے۔ اس لرزش و کپکپی سے صاحبِ عظمت و جلال کے لیے دل میں جو عجز و فروتنی اور پستی و نیاز مندی کی حالت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں بے نیازی کی جگہ فقر کا اور گھمنڈ کی جگہ اخبات کا جو احساس ابھرتا ہے وہ خشوع ہے۔ اسی طرح اس صاحبِ عظمت و جلال کے قہر و غضب سے بچنے، اس کے مقرر کردہ حدود کی مخالفت سے احتراز اور اس کے احکام و آیات کی خلاف ورزی سے اجتناب و احتیاط کی جو بے چینی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اور جو خلوت و جلوت ہر جگہ آدمی کو بیدار اور چوکنا رکھتی ہے وہ تقویٰ ہے۔

• مجھی سے بچو کا ٹکڑا بیک وقت دو حقیقتوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ مجھے کوئی بہت نرم چیز سمجھ کر میری گرفت اور میرے غضب سے بے پروا نہ ہو جاؤ۔ جو میری نعمت کی ناقدری کرتے ہیں، میرے عہد کو پامال کرتے ہیں، میری آیات کو مالِ بیع و شرا سمجھتے ہیں، جب میرا غضب ان پر نازل ہوتا ہے تو وہ ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے

اوراس وقت کوئی نہیں ہوتا ہے جوان کو میرے غضب سے چھڑانے کے لیے کھڑا ہوسکے۔

دوسری حقیقت جو مفعول کی تقدیم سے یہاں پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم ڈرتے ہو کہ اگر تم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی تو تمھارے عوام بگڑ کھڑے ہوں گے، تمھاری سرداری و پیشوائی خطرے میں پڑ جائے گی، تمھارے مقابل میں بنی اسماعیل کا سرا اونچا ہو جائے گا اور تمھارے دوسرے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچ جائے گا حالانکہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ڈرنے اور بچنے کی نہیں ہے، اصل ڈرنے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف میرا غضب ہے کیوں کہ اس سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ البتہ میں اگر چاہوں تو اپنے غضب سے ڈرنے والوں کو ہر خطرہ سے بچا سکتا ہوں۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۴۲)

لبس حق بالباطل کا مفہوم

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ: لبس الثوب کے معنی ہیں اس نے کپڑا پہن لیا۔ لبس الامر علیہ کے معنی ہیں اس نے معاملہ کو گڈ مڈ کر دیا۔ لَبَسَهُمْ کے معنی ہوں گے، ان کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا یا باہم ٹکرا دیا۔ قرآن مجید میں ہے اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا (یا تمھیں گروہ در گروہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا دے)

لبس الشیئ بالشیئ کے معنی ہوتے ہیں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ خلط ملط اور گڈ مڈ کر دیا۔ آیت زیر بحث میں حق پر باطل کو ڈھانک دینے کا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے۔ لبس کے اصل معنی میں یہ دونوں مفہوم مضمر ہیں اور یہاں یہ دونوں ہی بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب دوسری جگہ بھی استعمال ہوا ہے مثلاً فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۸۲ - انعام)	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے امن ہے اور وہ راہ یاب ہونے والے ہیں۔

آیت زیر بحث میں اشارہ ہے یہود کی اس بات کی طرف کہ انھوں نے تورات میں اپنی رائیں اور بدعتیں داخل کر کے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے حق اور اپنے داخل کیے ہوئے باطل کو ایک ساتھ گڈ مڈ کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۷۹ - بقرہ)	پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب تصنیف کرتے ہیں، پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آئی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے حاصل کریں حقیر قیمت، پس ان کی تباہی ہے اس چیز کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے باعث جو وہ کما رہے ہیں۔

یہود نے حق پر پردہ ڈالنے کے لیے تورات میں ہر قسم کے تصرفات کر ڈالے تھے۔ بعض چیزیں انھوں نے

اس میں اپنی طرف سے داخل کر دی تھیں، بعض چیزیں اس میں سے نکال دی تھیں اور بعض چیزوں میں انھوں نے تبدیلیاں کر دی تھیں اور ان تمام تصرفات سے مقصود ان کا ان حقائق پر پردہ ڈالنا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی، ان کی قربان گاہ اور ان کے قبلہ وغیرہ سے متعلق تورات میں بیان ہوئے تھے اور جو آخری نبی کی بعثت کی نشان دہی کرنے والے تھے۔ یہود کو چونکہ یہ بات دل سے ناپسند تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نشانی تورات سے ظاہر ہو اس وجہ سے انھوں نے ان تمام باتوں کو چھپانے کی کوشش کی۔[1]

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ، اس ٹکڑے میں کوئی خاص لغوی اشکال نہیں ہے البتہ وَتَكْتُمُوا کے اعراب کے بارے میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ بعض لوگ یہاں اَنْ کو پوشیدہ مانتے ہیں اس وجہ سے تکتموا کو نصب کی حالت میں قرار دیتے ہیں، بعض اس کو سابق پر عطف قرار دے کر اس کو جزم کی حالت میں مانتے ہیں۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ عطف کی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں حرف 'لا' کا اعادہ نہ کرنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کو ظاہر کر رہی ہیں پہلی بات کے بعد یہ دوسری بات صرف ایک وضاحت اور ایک بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہود نے حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے کی جو کوشش کی اس سے اصل مقصود ان کا حق کو چھپانا ہی تھا۔ تورات میں ان کو جس چیز سے روکا گیا تھا وہ تو یہی حق کو چھپانا تھا لیکن اس حق کو چھپانے کی جو شکل ظاہر میں انھوں نے اختیار کی تھی وہ حق اور باطل دونوں کو گڈمڈ کرنے کی تھی اس وجہ سے قرآن نے ان کو پہلے حق و باطل کو گڈمڈ کرنے سے روکا، پھر اس کتمان حق سے روکا جو درحقیقت حق و باطل کے التباس کی اس تمام کوشش کا اصل مقصود و مدعا تھا۔

'وَتَكْتُمُوا' کا اعراب

استاذ امامؒ اسی اصول پر لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ اور لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ والی آیات کی بھی تاویل کرتے ہیں۔ تفصیل ان کی اپنے مقام پر آئے گی۔

لفظ حق کی پوری تحقیق اسی سورہ میں آگے آ رہی ہے۔ یہاں موقع کلام سے واضح ہے کہ حق سے مراد وہ حقائق ہیں جو تورات میں واضح کر دیے گئے تھے اور جو اب قرآن نے اپنی تائید و تصدیق سے واضح سے واضح تر کر دیے ہیں۔ ان حقائق کا زیادہ تر تعلق نبی آخر الزمان کی نشانیوں سے تھا، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہود ان نشانیوں پر پردہ ڈالنے سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔

---

[1] اس قسم کی بعض باتوں کی طرف اشارہ آگے اس سورہ میں آئے گا۔ جو لوگ زیادہ تفصیل کے طالب ہوں، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے رسالہ ذبیح کا مطالعہ کریں۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّٰكِعِينَ (۴۳)

وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّٰكِعِينَ : اقامت صلوٰۃ کی پوری تحقیق شروع میں بیان ہو چکی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

لفظ زکوٰۃ کی تحقیق

زکوٰۃ : زکوٰۃ کا لفظ زکا۔ یزکوا سے ہے جس کے معنی پاک ہونے کے ہیں۔ عربی میں نفس زکیہ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہوں سے پاک صاف ہو۔ دوسرا مفہوم اس مادے کے اندر بڑھنے اور نشوونما پانے کا ہے۔ زکا الزرع کے معنی ہوں گے، کھیتی بڑھی اور اچھی۔ زکوٰۃ کے اندر پاکیزگی اور نشوونما دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے کہ زکوٰۃ نفس اور مال دونوں کو پاکیزگی بھی بخشتی ہے اور اس سے مال میں برکت اور بڑھوتری بھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

مثلاً فرمایا ہے :۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (۱۰۳۔ توبہ)	ان کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو، ان کو اس کے ذریعہ سے تم پاک کرو گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے :۔

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ ۖ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (۳۹۔ روم)	اور جو تم دیتے ہو سود تاکہ لوگوں کے مالوں میں بڑھوتری ہو تو یہ چیز اللہ کے ہاں نہیں بڑھتی اور جو تم دیتے ہو زکوٰۃ، اللہ کی رضا جوئی کے لیے، تو یہی لوگ اپنے دیئے ہوئے کو اللہ کے ہاں بڑھانے والے ہیں۔

زکوٰۃ کا لفظ ابتداء میں تو انفاق فی سبیل اللہ کی تمام قسموں کے لیے استعمال ہوتا رہا اور اس کا مفہوم وہی تھا جو لفظ صدقہ کا ہے لیکن بعد میں قرآن و حدیث کے استعمالات نے اس کو انفاق کی ان متعین مقداروں کے لیے خاص کر دیا جو اللہ اور رسول نے ہر مال میں غربا و فقراء کے لیے واجب کر دی ہیں۔

رکوع کا مفہوم

رکوع : کے معنی آگے کی طرف جھک پڑنے، تواضع ظاہر کرنے اور فقر و غربت سے پست ہو جانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس سے مراد نماز ہوتی ہے اس لیے کہ یہ نماز کے اہم ترین ارکان میں سے ہے۔ اس کے ساتھ مَعَ الرَّٰكِعِينَ (رکوع کرنے والوں کے ساتھ) کی قید، نماز باجماعت کی اہمیت اور اس کی تاکید کو ظاہر کرتی ہے۔ اگرچہ نماز باجماعت کا مفہوم أَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ کے الفاظ کے اندر بھی موجود ہے لیکن مخاطب کے خاص حالات کی وجہ سے اس مضمون کو واضح الفاظ میں الگ بھی بیان کر دیا ہے۔

نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کے اس حکم کے مخاطب، جیسا کہ سیاق کلام سے واضح ہے، یہود ہیں، اور اشارہ ان کے عوام و خواص سب کی طرف ہے جس عہد الٰہی کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس کے بنیادی احکام یہی تھے اور یہود نے ان کو بالکل ترک کر رکھا تھا۔ قرآن مجید

نے یہاں یہود کو ان احکام کے از سرِ نو زندہ کرنے کی طرف توجہ دلائی اور اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ انھوں نے عہدِ الٰہی کے ان بنیادی احکام کو بالکل ختم کر رکھا ہے لیکن صرف اشارہ کیا، اس بات کو صراحت کے ساتھ نہیں کہا تا کہ وہ بحث و تردید کے لیے نہ الجھ پڑیں۔

یہود کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ انھوں نے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام تقریباً ختم کر دیئے تھے۔

نماز اور زکوٰۃ کے معاملہ میں یہود کا رویہ

جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کا حکم تو ان کے صحیفوں میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے یہاں تک کہ ان کے ایک فرقے کا تو یہ خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس چیز کا حکم دیا ہی نہیں تھا، یہ محض بعد والوں کی بدعت ہے۔

زکوٰۃ کا اگرچہ انھوں نے انکار تو نہیں کیا لیکن ان کے علما اور کاہنوں نے اس کا مصرف فقرا اور مساکین کے بجائے اپنے آپ کو قرار دے لیا۔ چنانچہ کتاب احبار، جس میں کاہنوں کے حقوق و فرائض اور نذر اور قربانیوں وغیرہ کا بیان ہے، فقرا اور مساکین کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ پیداوار کے عشر، پہلوٹھی کے فدیے اور ہر قسم کی نذریں اس میں کاہنوں کے لیے مخصوص کر دی گئی ہیں اور اس طرح زکوٰۃ کے اصلی حق دار فقرا اور غربا کے بجائے علما اور کاہن بن کے رہ گئے۔ قرآن مجید نے نماز اور زکوٰۃ دونوں معاملوں میں شریعتِ الٰہی کا حکم بھی واضح کیا اور یہود کی زیادتیوں پر نہایت واضح الفاظ میں ان کو ملامت بھی کی۔

نماز کے متعلق قرآن مجید نے یہ واضح کیا کہ سب سے پہلی چیز جو یہود پر فرض کی گئی وہ نماز ہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلا حکم نماز ہی کا دیا گیا۔ چناں چہ ارشاد ہے۔

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (۱۴ - طٰه)	بے شک میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں ہو میری ہی بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (۸۷ - یونس)	اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر مقرر کرلو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو۔

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ یہود کی جماعتی شیرازہ بندی سب سے پہلے نماز با جماعت کے ذریعہ ہی سے ہوئی تھی لیکن اس کی اہمیت بعد میں انھوں نے بالکل ختم کر دی۔

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کے الفاظ کی روشنی میں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک اس حقیقت کی طرف کہ یہاں یہود کو رکوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ انھوں نے رکوع کو

بالکل ترک کر دیا تھا۔[1]

دوسرے نماز با جماعت کے اہتمام کی طرف، وہ اس طرح کہ لیڈروں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ نمازوں میں غربا اور عوام کے ساتھ شریک ہوں اور ان کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں، کیوں کہ پہلی چیز جو نماز کو ڈھانے والی ہے وہ یہی ترک جماعت ہے۔ امرا، عوام کے ساتھ مسجدوں کی حاضری کو کسرِ شان سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز کی عزت کم ہو جاتی ہے اور مسجدوں کی حاضری صرف غربا کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے۔ نماز باجماعت کی اسی اہمیت کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو بھی جماعت کے اہتمام کی تاکید فرمائی۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۴۳۔ آل عمران) — اے مریم اپنے رب کی فرماں بردار رہ اور سجدہ اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۴۴)

'بِرّ' کا مفہوم

بِرّ: 'بِرّ' کا لفظ عربی زبان میں ایفائے عہد، وفاداری اور ادائے حقوق کے معنی میں آتا ہے۔ حقوق میں ہر قسم کے حقوق شامل ہیں۔ بنیادی اور حقیقی بھی۔ مثلاً خدا کی فرماں برداری، والدین کی اطاعت اور خلق کے ساتھ ہمدردی۔ پھر آگے چل کر اس میں وہ حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قول و قرار اور معاہدات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر بھی حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے۔ اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی) عقوق (والدین کی نافرمانی) غدر (بے وفائی) اور ظلم کا ضد ہے۔ بَرٌّ اور بَارٌّ اس سے صفت کے صیغے استعمال ہیں مثلاً کہیں گے بَرٌّ بِوَالِدِهٖ وہ اپنے باپ کا فرماں بردار ہے۔ بَرَّ بِالْقَسَمِ کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کی۔ قرآن مجید میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں وارد ہے وَكَانَ تَقِيًّا وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (۱۴۔ مریم) (وہ پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرماں بردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا) دوسری جگہ فرمایا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۥ (۹۲۔ آل عمران) (تم خدا کی فرماں برداری کا حقیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو) اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ہے اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۲۸۔ طور) (بے شک وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا اور مہربان ہے) نیز فرمایا ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۲۔ مائدہ) (اور تعاون کرو ایفائے حقوق اور تقویٰ کے کاموں میں اور نہ تعاون کرو

---

[1] استاذ امام رحمۃ اللہ کے نزدیک یہود اپنے اوپر سال میں صرف ایک مرتبہ سجدہ کرنا واجب سمجھتے تھے اور اس کے لیے بھی ان کے علما نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی شخص کھڑے کھڑے کسی دیوار یا کھمبے پر اپنی پیشانی رکھ دے تو ادائے فرض کے لیے یہ بھی کافی ہے۔ معلوم نہیں مولاناؒ نے اس بیان کا ماخذ کیا ہے لیکن تورات میں یہود کو بار بار جو گردن کش کہا گیا ہے اس کی وضاحت ان کے اس طرزِ عمل کی روشنی میں بخوبی ہو جاتی ہے۔

حق تلفی اور تعدی کے کاموں میں) اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بِرّ کا لفظ ایک پہلو سے نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں پر مشتمل ہے لیکن اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے یہ حقوق اور فرائض کے ایفا کے لیے آتا ہے۔

اس آیت کے مخاطب یہود کے علما اور اکابر ہیں۔ آخر کا ٹکڑا وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ (اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو) ہمارے اس خیال کی نہایت واضح طور پر تائید کر رہا ہے۔ ان علما اور اکابر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ تم عوام کو تو بڑے زوروں سے حقوق اور فرائض ادا کرنے کی تلقین کرتے ہو لیکن یہ تلقین کرتے وقت اپنے آپ کو بالکل بھول جاتے ہو۔ لوگوں کو تو نصیحت کرتے ہو کہ اپنے مال تمھارے حوالہ کریں لیکن خود تمھارے اوپر خدا کے اور غریبوں کے جو حقوق ہیں ان کا خیال تمھیں کبھی نہیں آتا، بلکہ تم لوگوں کا دبا ہوا مال ہڑپ کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ تم نے دوسروں پر تو اپنی اطاعت پوری سطوت کے ساتھ واجب کر رکھی ہے، یہاں تک کہ تم ان کے رب بن بیٹھے ہو لیکن خود خدا کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری سے بالکل آزاد ہو، نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر کے تم نے پورے دین کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ علمائے یہود کی اس حالت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی نہایت بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

"اس نے کہا اے شرع کے عالمو، تم پر بھی افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے۔" (لوقا باب ۱۱ - ۴۶)

غور کیجیے، انجیل کے ان الفاظ اور قرآن مجید کے مذکورہ بالا الفاظ میں کتنی مطابقت ہے!

وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ (اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو) یعنی تم دین و شریعت کے عالم ہو اور جانتے ہو کہ از روئے عقل و نقل تم پر شریعت کی ذمہ داریاں دوسروں کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔

وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ (۴۵)

لفظ صبر کی تحقیق

لفظ صلوٰۃ کی تحقیق بقرہ کی آیت ۳ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم صرف لفظ صبر کی تحقیق پر کفایت کریں گے۔

لفظ صبر کے اصل معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت نے کچھ زیادہ پاکیزہ صورت اختیار کر لی ہے، یعنی قرآن میں عموماً اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے ان کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہ دے۔

صبر کا مفہوم لوگ عام طور پر عجز و مسکنت سمجھتے ہیں لیکن لغتِ عرب اور استعمالاتِ قرآن میں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ استاذ امامؒ اپنی تفسیر سورۂ والعصر میں کلام عرب کی روشنی میں اس عام خیال کی تردید مندرجہ ذیل

الفاظ میں فرماتے ہیں:

"لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ یہ عزم اور قوت کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے:۔

وغمرة موت ليس فيها هوادة ۔۔۔ يكون صدور المشرفي جسورها

اور موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا ہیں جن پر تلواروں کے پل ہیں۔

صبرنا له في نهكها ومصابها ۔۔۔ باسيافنا حتى يبوخ سعيرها

ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابل اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھلائی۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔

اصبغ کا شعر ہے۔

يا ابن الجحاجحة المدارة ۔۔۔ والصابرين على المكاره

اے شریف سرداروں اور شدائد پر صبر کرنے والوں کی اولاد۔

زہیر بن ابی سلمیٰ نے کہا ہے۔

تود الجياد واصهار الملوك وصبر ۔۔۔ في مواطن لو كانوا بها سئموا

اصیل گھوڑوں کی سواری، بادشاہوں کی دامادی اور ایسے مورچوں میں ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھیں۔

صبر کے اصلی معنی قرآن مجید نے خود بھی واضح کر دیے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ ۔۔۔ اور ثابت قدمی دکھانے والے سختی میں، تکلیف میں

وَحِينَ الْبَأْسِ (۱۷۷۔ بقرہ) ۔۔۔ اور لڑائی کے وقت۔

اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر کیے ہیں: غربت، بیماری اور جنگ، غور کیجیے تو تمام مصائب و شدائد کے سرچشمے یہی تین ہیں۔"[1]

اوپر عہد الٰہی کو از سر نو استوار کرنے کے لیے بنی اسرائیل کو جن باتوں کا حکم دیا ہے یا جن سے روکا ہے ان کا اختیار کرنا یا ان سے بچنا نفس کے لیے نہایت شاق ہے اس وجہ سے وہ نسخہ بھی بتا دیا ہے جو اس مشکل کام کو آسان بنا سکتا ہے۔ یہ نسخہ صبر اور نماز کے دو جزوں پر مشتمل ہے۔ ان دو چیزوں کے اختیار کرنے سے نفس کے لیے یہ چڑھائی آسان ہو جاتی ہے۔ صبر کا تعلق اخلاق و کردار سے ہے اور نماز کا تعلق عبادات سے ہے۔ انسان کے اندر اگر مشکلات و موانع کے علی الرغم حق پر ڈٹے رہنے کی خصلت موجود نہ ہو تو وہ دنیا میں

---

[1] تفسیر سورہ والعصر مولانا فراہیؒ فصل ۶

کوئی اعلیٰ کام تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا، لیکن مشکلات و موانع کے علی الرغم کسی صحیح موقف پر ڈٹے رہنے کی خصلت انسان کے اندر آسانی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ریاضت سے پیدا ہوتی ہے جس کا طریقہ نماز ہے۔ آدمی اگر ایک صحیح راہ پر چلنے کا عزم کرلے اور اس پر چل کھڑا ہو اور ساتھ ہی برابر اپنے رب کو یاد رکھے اور اس سے مدد مانگتا رہے (جس کی بہترین شکل نماز ہے) تو اس کے عزم کی قوت ہزار گنی بڑھ جاتی ہے، کوئی مشکل سے مشکل حالت بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا ہونے نہیں دیتی، اگر حالات کی نزاکت سے آدمی کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا وہ تعلق جو نماز کے واسطہ سے قائم ہوتا ہے، اس کو گرنے سے بچا لیتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہاں صبر کا جو حکم دیا ہے وہ اس لیے دیا ہے کہ اس وصف کو پیدا کیے بغیر کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے عہد پر قائم نہیں رہ سکتی اور نماز کا حکم اس لیے دیا ہے کہ یہی چیز صبر کے پیدا کرنے، اس کو ترقی دینے اور اس کو درجۂ کمال تک پہنچانے کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ آگے ان آیات پر تدبر کے سلسلہ میں چونکہ اس مسئلہ پر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے اس وجہ سے یہاں صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اگرچہ اس کو ہم نے اختیار نہیں کیا ہے لیکن ہے وہ نہایت لطیف۔ آگے ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

وَاِنَّہَا میں ضمیر کا مرجع

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ : اس ٹکڑے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وَاِنَّهَا میں ھَا کا مرجع کیا ہے؟ مجاہد کے نزدیک اس کا مرجع صلوٰۃ ہے۔ اسی قول کو امام ابن جریرؒ نے ترجیح دی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ نماز نفس پر بہت بھاری ہے، صرف وہی لوگ اس بار گراں کو اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر خدا کا خوف ہو اور جن کے دل آخرت کی باز پرس کے ڈر سے ہر وقت خدا کے آگے جھکے رہتے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مرجع وہ ہدایت و نصیحت ہے جو پچھلے جملہ میں مذکور ہوئی ہے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ پہلے قول کے حق میں ہیں اور اس کی تائید میں انھوں نے چند دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں 'صبر' کو نظر انداز کر کے صرف نماز کے بھاری اور مشکل ہونے کے ذکر کرنے کی تین وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ صبر کا شاق اور گراں ہونا بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی مثال میں وہ آیت وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ[1] پیش کرتے ہیں کہ اس میں یہ فرمایا کہ اللہ صابروں کے ساتھ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی معیت کا حاصل ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح صبر کا مشقت طلب ہونا چونکہ واضح تھا اس وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا، صرف نماز کا ذکر کیا۔

---

[1] مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ (۱۵۳- بقرہ)

دوسری وجہ یہ ہے کہ صبر نماز کے لازمی شرائط میں سے ہے۔ صرف وہی لوگ نماز پر قائم رہ سکتے ہیں جن کے اندر صبر کی خصلت موجود ہے۔ نماز کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جب یہ بات کہہ دی گئی کہ نماز ایک بھاری اور مشکل چیز ہے تو گویا اس کے بھاری اور مشکل ہونے کے پہلو کی طرف خود بخود اشارہ ہوگیا، کہ یہ اس وجہ سے بھاری اور مشکل ہے کہ اس کے لیے صبر درکار ہے۔ اس اشارہ نے صبر کے تصریح کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت سے مستغنی کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صبر کا ایک سخت چیز ہونا چونکہ واضح ہے اس وجہ سے اس کی سختی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا حکم دینا مخاطب کی طبیعت پر گراں گزرتا اس وجہ سے اس کی سختی کا حوالہ نہیں دیا۔ صرف نماز کی سختی کا حوالہ دیا جو بظاہر ایک آسان چیز ہے۔

یہ نکتے اگرچہ نہایت لطیف ہیں اور ان سے زیر بحث آیت کے بعض نہایت اہم گوشے روشنی میں آتے ہیں لیکن میرا اپنا رجحان دوسرے قول کی طرف ہے۔ یعنی "ھا" کا مرجع میرے نزدیک صبر و صلوٰۃ سے استعانت کی وہ تلقین ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں وارد ہوئی ہے۔ عربی زبان اور قرآن مجید میں اس اسلوب بیان کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہم قرآن مجید سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ (۸۰۔ قصص)	اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا، تمہارا برا ہو، اللہ کا اجر ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے لیکن ایمان اور عمل صالح کا مرتبہ نہیں عطا ہوتا مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہوں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (۳۴-۳۵۔ حم سجدہ)	اور بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہوسکتیں، تم ان کی برائی کو بھلائی سے دفع کرو تو تم دیکھو گے کہ جس کے درمیان اور تمہارے درمیان شدید عداوت ہے، وہ تمہارا سرگرم حامی بن گیا ہے اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کریں اور یہ دانش نہیں ملتی مگر نصیبہ ور کو۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ای وما یلقی ھذہ الوصیۃ الا الذین صبروا وما یلقاھا ای یوتاھا ویلھمھا الا ذو حظ عظیم (یعنی یہ ہدایت نہیں عطا ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہوں وما یلقھا کے معنی ہیں کہ یہ ہدایت نہیں ملتی یا نہیں الہام ہوتی مگر ان کو جو بڑے

نصیب والے ہوں)

اس قول کو اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں "ھا" کی ضمیر کا تعلق صرف نماز سے نہیں رہ جاتا بلکہ صبر اور نماز دونوں سے ہو جاتا ہے۔ یہ بات عربی زبان کے قواعد کے بھی مطابق ہے اور اصل حقیقت کے بھی، کیوں کہ نفس پر شاق درحقیقت یہ دونوں ہی چیزیں ہیں۔ صبر کے مشکل ہونے میں تو کسی کو کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ نماز بھی مداومت اور پابندی کی شرط کے ساتھ اتنی سخت چیز بن جاتی ہے کہ اہل توفیق ہی ہیں جو اس کو نباہ سکتے ہیں۔

لَكَبِيْرَةٌ۔ کبیرۃ کے معنی یہاں بھاری، ثقیل اور شاق کے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مواقع پر یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (۱۴۳ - بقرہ) (بے شک بھاری چیز ہے مگر ان کے لیے جن کو خدا ہدایت دے دے) وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ (۳۵ - انعام) (اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے)

خشوع کا مفہوم

اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ، خشوع کی اصل حقیقت پستی اور فروتنی اور عجز و تذلل ہے۔ آواز پست ہو تو یہ لفظ اس کے لیے بھی بولا جائے گا، نگاہ جھکی ہوئی ہو تو اس کے لیے بھی بولا جائے گا۔ اونٹ کا کوہان لاغری کے سبب سے بیٹھ جائے تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہو گا۔

اوپر عہد الٰہی پر استوار رہنے کے لیے صبر اور نماز سے استعانت کی جو نصیحت کی گئی ہے اس کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ یہ راہ سہل انھی کے لیے ہے جن میں خشوع ہو، جو خدا سے ڈرنے والے ہوں، جو غرور و سرکشی کی بیماری سے پاک ہوں اور جن کے دل خدا کے حضور جواب دہی کے تصور سے ہر وقت اندیشہ ناک رہتے ہوں۔ وہ لوگ اس راہ پر نہیں چل سکتے جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہوں، جو قومی اور نسلی غرور کے گھمنڈ میں مبتلا ہوں اور جو خدا اور آخرت سے زیادہ اپنی امارت و سیادت کی ساکھ جمائے رکھنے کی فکروں میں مبتلا ہوں۔

یہ خشوع صبر اور نماز دونوں کی بنیاد ہے۔ صبر سے یہاں مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہر طرح کے مصائب و شدائد اور ہر قسم کے ایذا و استخفاف کے باوجود خدا کے عہد پر جمے رہنا ہے اور یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل پر خدا کی ایسی ہیبت و عظمت طاری ہو کہ اس کے مقابل میں ہر مصیبت و ذلت اس کو ہیچ معلوم ہوتی ہو۔

اسی طرح نماز کے متعلق ہر صاحب علم پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اس کی بنیاد ہی خشوع و خضوع پر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے۔ مثلاً:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۱ - مومنون) ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں۔

دوسرے مقام میں ہے:

وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (۹۰۔ انبیاء)

وہ ہمیں پکارتے ہیں امید وبیم کے ساتھ اور وہ ہم سے عاجزی کرنے والے ہیں۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۴۶)

لفظ ظن کی تحقیق

آدمی کسی چیز کے متعلق اس کے دیکھے بغیر جو رائے قائم کرتا ہے اس کو ظن کہتے ہیں۔ اس طرح کی رائے پر بالعموم چونکہ یقین نہیں ہوا کرتا اس وجہ سے ظن کا لفظ کچھ شک کے ہم معنی سا بن گیا ہے۔ چناں چہ عربی زبان اور قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ طرفہ کا مشہور شعر ہے۔

واعلم علمًا لیس بالظن انہ ——— اذا ذل مولی المرء فھو ذلیل

(میں ایک بات جانتا ہوں جو محض گمان نہیں ہے کہ جب آدمی کا چچازاد بھائی ذلیل ہو جاتا ہے تو وہ خود بھی ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے)

اسی طرح قرآن مجید میں ہے اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۳۲۔ جاثیہ) (ہم محض ایک گمان کر رہے ہیں اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں)

لیکن ایک بن دیکھی چیز کے متعلق جو رائے قائم کی جاتی ہے ضروری نہیں کہ وہ مشکوک ہی ہو۔ بسا اوقات یہ رائے یقین پر مبنی ہوتی ہے لیکن ظن کا لفظ اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ظن کا یہ استعمال اس کے عام معنی کے لحاظ سے ہوتا ہے، اس میں شک کا مفہوم مضمر نہیں ہوتا۔ اوس بن حجر کا ایک شعر ہے:

الالمعی الذی یظن بك الظن ——— كان قد رای وقد سمعا

(وہ ذہین کہ اگر تمہارے بارے میں کوئی گمان بھی کرے تو معلوم ہوتا ہے دیکھ کر اور سن کر کرتا ہے)

درید بن صمہ کہتا ہے:۔

فقلت لهم ظنوا بالفی مدجج ——— سراتهم فی الفارسی المسرد

(میں نے ان سے کہا کہ دو ہزار سلاح پوش سواروں کا یقین کرو جن کے سردار باریک کڑیوں کی زرہیں پہنے ہوں گے)

یہ خاشعین کی مزید تعریف ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور اپنے رب سے ملنے کا گمان رکھتے ہیں، آخرت سے بے پروا اور بے فکر نہیں ہیں۔

خاشعین کی تعریف میں یہ بات ان کے باطن پر روشنی ڈالتی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے اوپر عجز و مسکنت اور پستی و فروتنی کی جو حالت طاری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں آخرت کا خوف اور خدا کے سامنے حاضری کا ڈر سمایا ہوا ہے۔

خاشعین کی اس باطنی حالت کی تعبیر کے لیے ظن کے لفظ کے استعمال میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ لفظ اندیشہ اور گمان غالب سے لے کر یقین اور قطعیت تک کی حالت کی تعبیر کے لیے کافی ہے اور آخرت کا معاملہ ایک ایسا اہم معاملہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی کو جب اس کے بارہ میں یقین حاصل ہو جائے تب ہی اس کے لیے تیاری کرے، بلکہ اس کا اندیشہ اور گمان بھی اس بات کے لیے کافی ہے کہ آدمی اس

کے لیے تیار رہے۔ ایک عظیم بند جس کے ٹوٹ جانے سے پورے شہر کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہو ہماری توجہ کا طالب صرف اسی وقت نہیں ہوتا جب کہ پانی اس کی دیواروں میں دراڑیں پیدا کر دے بلکہ اس کے ٹوٹنے کے ہولناک اندیشہ کے پیش نظر اس وقت بھی اس کی حفاظت کا اہتمام ہوتا ہے جب کہ وہ بظاہر بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے خطرے کے معاملہ میں جب انسان کی پیش بینی کا یہ حال ہے تو آخر مرنے کے بعد کی زندگی اور آخرت کے معاملہ میں، جس کا تعلق ایک ابدی زندگی سے ہے، وہ اتنا بے حس اور بلید کیوں ہو جائے کہ اس کے تمام آثار و علامات سے آنکھیں بند کیے ہوئے رہے اور اس وقت تک اس کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہ سمجھے جب تک اس کو اس کا پورا پورا یقین نہ ہو جائے۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ: "اور یہ کہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں" کے الفاظ بیک وقت توحید اور تفویض کی دو حقیقتوں کو ظاہر کر رہے ہیں۔

توحید کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آخرت میں سارے معاملات صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے سامنے پیش ہوں گے، وہی جزا اور سزا دے گا، اور وہ جو کچھ دے گا پورے عدل و انصاف کے ساتھ دے گا، کسی دوسرے کی مجال نہ ہوگی کہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے یا اس کے غضب سے بچا سکے۔ یہ مضمون اِلَيْهِ کی تقدیم سے پیدا ہوتا ہے اور اس توحید کا حوالہ یہاں اس لیے ضروری ہوا کہ اگر عقیدۂ شرک کا کوئی شائبہ دل میں موجود رہے تو خدا کی ملاقات کا عقیدہ بالکل بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ مشرک یہ سمجھتا ہے کہ اوّل تو خدا اپنے شرکاء کے لحاظ میں اس کے اوپر ہاتھ ہی نہیں ڈالے گا اور اگر ڈالے گا تو اس کے شرکاء اس کو اپنی سعی و سفارش سے بچا لیں گے۔

تفویض کا پہلو یہ ہے کہ اللہ کے عہد بندگی پر قائم رہنے والوں کو جو مشکلیں اور اذیتیں پیش آتی ہیں وہ ہر چیز کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ جس کی راہ میں یہ سب کچھ جھیل رہے ہیں، ہر قدم پر اسی کی طرف بڑھ رہے ہیں، پھر جب آگے وہ ہے جس کی طلب ہے تو پیچھے کے اس سارے شور و غوغا کی کیا پروا۔

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

۲۸۔ مجموعۂ آیات ۴۰۔۴۶ میں مطالب کی ترتیب

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت کے بعد اب ہم مختصر طور پر یہ بتائیں گے کہ مذکورہ بالا مجموعۂ آیات میں مطالب کی ترتیب کیا ہے تاکہ کلام کا نظم بھی واضح ہو جائے اور ہر بات کی دلیل بھی سامنے آ جائے۔

اس مجموعۂ آیات میں پہلے بنی اسرائیل کو تین چیزوں کی یاد دہانی کی گئی ہے۔

ایک اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو انعامات فرمائے ہیں ان کو وہ یاد رکھیں۔ ان کو بھول نہ جائیں۔ یہ انعامات اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان پر ہوئے ہیں۔ ان کے ذاتی یا خاندانی استحقاق کا نتیجہ نہیں ہیں جن پر وہ آبائی وراثت کی حیثیت سے قابض رہیں۔

دوسری اس بات کی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا ہے اس کو وہ پورا کریں۔ وہ اس عہد کو پورا کریں گے تو اللہ تعالیٰ وہ عہد پورا کرے گا جو اس نے ان سے کیا ہے۔

تیسری اس بات کی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ڈریں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈریں۔

قرآن پر ایمان لانے کی دعوت تین پہلوؤں سے

ان تینوں باتوں کی یاد دہانی کرنے کے بعد ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور یہ دعوت درحقیقت انھی تینوں چیزوں پر مبنی ہے جن کی اوپر یاد دہانی کی گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

انعام کے پہلو سے ان کے لیے قرآن پر ایمان لانا اس لیے ضروری قرار دیا کہ ان کو جو ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا ہوئی تھیں قرآن کے ذریعہ سے انھی نعمتوں کی تکمیل ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی شکل میں ان پر آخری فضل فرمایا۔ اور اس فضل کا اس کے ظہور سے پہلے ہی اس نے وعدہ بھی فرمایا تھا تاکہ بنی اسرائیل اس سے بے خبر اور ناآشنا نہ رہیں بلکہ اس سے آشنا اور اس کے منتظر رہیں تاکہ جب یہ نعمت نازل ہو تو خود بھی اس کو بڑھ کر قبول کریں اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ چنانچہ جب یہ موعود نعمت نازل ہوئی تو ان کو دعوت دی گئی کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کریں۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو یہ سب سے بڑا کفرانِ نعمت ہوگا جس کے وہ مرتکب ہوں گے اور اس کے بعد وہ اپنے لیے امید کا آخری دروازہ بھی بند کرلیں گے۔

عہد کے پہلو سے اس دعوت کو قبول کرنا اس لیے ضروری ٹھہرا کہ اس کتاب اور اس نبی پر ایمان لانے کا بنی اسرائیل سے تورات میں عہد لیا جا چکا تھا۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر پر ایمان نہ لانے کے معنی یہ تھے کہ انھوں نے محض محبتِ دنیا میں پھنس کر اس عہد کو توڑ دیا جو وہ اپنے رب کے ساتھ باندھ چکے تھے۔

خشیتِ الٰہی کے پہلو سے اس دعوت پر ایمان لانا اس لیے ضروری ٹھہرایا کہ ان واضح تصریحات اور ان قطعی عہود کے باوجود جو تورات میں موجود ہیں بنی اسرائیل کی طرف سے اس دعوت کی تکذیب اور مخالفت کی راہ میں پیش قدمی ایک ایسی جسارت تھی جو خدا کے غضب کو دعوت دینے والی تھی۔ قرآن نے ان کو متنبہ کیا کہ ان موہوم اندیشوں کے لیے جو اس دعوت کے قبول کرلینے کی صورت میں نظر آتے ہیں خدا کے اس حتمی عذاب سے بے پروا نہیں ہو جانا چاہیے جو اس دعوت کی تکذیب کی صورت میں لازماً نازل ہو کر رہے گا۔

اس عام یاد دہانی اور دعوت کے بعد خاص طور پر ان کے علماء اور لیڈروں کو مخاطب کر کے یہ تنبیہ فرمائی کہ جانتے بوجھتے اور کتاب و شریعت کا علم رکھتے ہوئے اپنی قوم کو گمراہ کرنے کے لیے حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے اور حق کو چھپانے کا وہ کاروبار انھیں نہیں کرنا چاہیے جس میں وہ اس وقت پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں۔ انھیں کتاب و شریعت کا جو علم ملا ہے اس کا اصلی حق یہ ہے کہ وہ اس کی روشنی میں اپنے عوام کی صراطِ مستقیم کی

طرف رہنمائی کریں نہ کہ اس منصب سے غلط فائدہ اٹھا کر ان کو اندھا بنانے کے لیے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکیں۔

عوام اور خواص دونوں طبقات کے اس بگاڑ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بالترتیب مذکورہ دونوں خرابیوں کا علاج بھی بتایا۔

پہلے اس عام خرابی کو لیا ہے جو کفرانِ نعمت، نقض عہدِ الٰہی اور خدا سے بے خوفی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ان تینوں بیماریوں کے علاج کے لیے بنی اسرائیل کو تین باتوں کا حکم دیا۔ نماز، زکوٰۃ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کا۔

نماز کا حکم اس لیے دیا کہ وہ ذکر و شکر کا مجموعہ اور ان تمام عہود کا سرنامہ ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوئے ہیں۔ اس کے اہتمام سے ان تمام چیزوں کی زندگی کی راہ کھل جاتی ہے جن پر شریعت الٰہی قائم ہے۔ نماز کی اس حقیقت کی طرف ہم اس سورہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اشارات کر چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

زکوٰۃ کا حکم اس لیے دیا کہ یہی اس مرض بخالت اور اس محبت دنیا کا علاج ہے جس کے سبب سے یہود اللہ تعالیٰ کا پیمان توڑنے اور خدا کی شریعت کو دنیا کی متاعِ قلیل کے عوض فروخت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہود پر اس مرض کا جس قدر غلبہ تھا اس کا اندازہ قرآن مجید کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝	اور ان میں سے وہ بھی ہیں جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے پاس ایک دینار کی بھی امانت رکھو تو وہ اس کو ادا کرنے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے معاملہ میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے، وہ جانتے بوجھتے اللہ پر یہ افترا باندھ رہے ہیں۔ اللہ کا معاملہ تو یوں ہے کہ جو اس کے عہد کو پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے حقیر قیمت لے رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ ان سے قیامت کے روز بات نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔
(آل عمران ۷۵-۷۷)	

رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کا حکم اس لیے دیا کہ عام نمازیوں کے ساتھ نمازوں کی حاضری ان کے کبر و نخوت کو توڑے، ان کے اندر خاکساری اور تواضع پیدا کرے، اور یہ خاکساری و تواضع ان کے لیے آنحضرتؐ کی بعثت پر ایمان لانے کی راہ کھولے جس پر ایمان لانے میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ غرور تھا کہ وہ اسرائیل کے برتر گھرانے سے ہو کر امیوں کے اندر سے اٹھنے والے ایک رسول پر کس طرح ایمان لائیں۔

یہود کے عام بگاڑ کا علاج بتانے کے بعد ان کے علما کی طرف توجہ فرمائی اور ان کا مرض یہ بتایا کہ وہ عوام کو تو نیکی اور دینداری کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس تلقین کے وقت وہ خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، حالانکہ نیکی اور دینداری کی ان باتوں کے جتنے مخاطب عوام ہیں اس سے زیادہ ان کے مخاطب یہ خود ہیں، اس لیے کہ کتاب الٰہی کے اسرار و رموز سمجھنے اور جاننے والے یہی ہیں۔ اگر یہ اپنے آپ کو بھی اسی طرح خدا ترس اور خدا کے حقوق و فرائض کو پہچاننے والا بنالیں جس طرح یہ عوام کو بنانا چاہتے ہیں تو چشم زدن میں لوگوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں اس لیے کہ یہ ساری رکاوٹیں انھی کی پیدا کی ہوئی ہیں، کسی اور کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان نصیحت کرنے والوں کے خود اپنے کان بالکل بہرے واقع ہوئے ہیں۔

ان تنبیہات و ہدایات کے بعد وہ طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کر کے بنی اسرائیل اس آخری بعثت پر ایمان لانے کے مشکل کام کو اپنے لیے آسان بنا سکتے تھے۔ وہ طریقہ صبر اور نماز کا طریقہ ہے۔ فرمایا کہ اگر اپنی خواہشات و بدعات کو چھوڑ کر اور اپنی جھوٹی جاہی سیادت و امارت سے دستکش ہو کر قرآن پر ایمان لانا مشکل معلوم ہوتا ہے تو اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے صبر اور نماز سے مدد چاہو، یہ دونوں سہارے اس چڑھائی کو آسان بنائیں گے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے کی فصلوں میں آئے گی۔

۲۹۔ دین میں نماز کی اہمیت

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نماز کا ذکر یکے بعد دیگرے دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلے فرمایا وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ) (۴۳)، پھر ایک ہی آیت کے بعد فرمایا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ

۱؎ کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ وارکعوا مع الراکعین میں یہود کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اللہ کے جو بندے آج اللہ کی بندگی کی دعوت لے کر اٹھے ہیں اور اجتماعی شکل میں اس کی عبادت کر رہے ہیں اس عبادت کے خلاف مہم چلانے کے بجائے تم بھی اس عبادت میں شریک ہو جاؤ۔ اگر اس کا یہ مطلب لے لیا جائے تو یہ گویا دوسرے الفاظ میں اسی دعوت کا اعادہ ہے جو وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کے الفاظ سے بنی اسرائیل کو دی گئی ہے۔

(اور مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے اور یہ چیزیں بھاری ہیں مگر ان لوگوں پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں ۴۵)

نماز کا ذکر دو مختلف پہلوؤں سے

ظاہر ہے کہ ان دونوں مواقع پر نماز کا ذکر دو مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔ پہلے موقع پر اس کا ذکر اس پہلو سے ہوا ہے کہ ایمان باللہ اور اقرارِ توحید کے بعد یہی اس عہد و میثاق کی پہلی دفعہ کی حیثیت رکھتی ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ اور دوسرے موقع پر اس پہلو سے ہوا ہے کہ یہی چیز درحقیقت تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ، سب کی کلید، سب کی مددگار، اور سب کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ شریعت کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے اور پھر شریعت کا قیام و بقا بھی اسی پر منحصر ہے پہلے مرحلہ میں اس کا لازمہ زکوٰۃ ہے۔ دوسرے مرحلہ میں اس کا ساتھی صبر ہے۔ دین جب عقیدہ سے نکل کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کا اوّلین قدم یہی ہوتا ہے اور پھر دین کی اقامت اور عہدِ الٰہی کی تجدید کے لیے جو جدوجہد عمل میں آتی ہے اس میں بھی اوّلین اہمیت اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی اس اہمیت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دونوں پہلوؤں پر بالاجمال گفتگو کریں۔ اس فصل میں اس پر پہلے نقطۂ نظر سے گفتگو کریں گے، اس کے بعد مستقل عنوان سے اس کے دوسرے پہلو کی وضاحت کریں گے۔

احکامِ شریعت کی بنا نماز اور زکوٰۃ پر ہے

ساتویں فصل میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ تمام احکامِ شریعت کی بنیاد درحقیقت نماز اور زکوٰۃ پر ہے۔ نماز ان تمام احکام کا سرچشمہ ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور زکوٰۃ ان تمام احکام کا منبع ہے جو حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ یہاں موقع کے اقتضا سے ہم چند ایسی آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان جو عہد و پیمان ہوا ہے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس میں جس چیز کو حاصل ہے وہ نماز ہے۔ بنی اسرائیل کے میثاق کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا ہے ؎

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ	اور یاد کرو جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ	اور اٹھائے ان میں سے بارہ نقیب اور اللہ نے کہا کہ
وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ	میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرتے رہو گے
وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ	اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے
وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ	اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے
قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ	اگر تم یہ سب کچھ کرتے رہو گے تو میں تمہارے گناہ
سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	تمہارے اوپر سے جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ	میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری
ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ	ہوں گی، لیکن جس نے اس عہد کے بعد تم میں سے
السَّبِيْلِ (۱۲- مائدہ)	کفر کیا تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

یہ قرآن مجید نے اس عہد کا حوالہ دیا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ اس میں دیکھیے کہ پہلی چیز جس کا

ذکر آیا ہے وہ نماز کا قائم رکھنا ہے۔

اسی طرح جہاں بنی اسرائیل کے دورِ زوال و انحطاط کا ذکر کیا ہے وہاں سب سے پہلے ان کے اندر سے جس چیز کے غائب ہونے کا ذکر کیا ہے وہ نماز ہی ہے اور اسی کے غائب ہونے کا نتیجہ یہ بیان کیا ہے کہ وہ شہوات و خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ فرمایا۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا	پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنھوں نے
الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ	نماز ضائع کردی اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے تو یہ
يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹۔ مریم)	عنقریب ایک بڑی گمراہی سے دوچار ہوں گے۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عہدِ الٰہی پر قائم رہنے کے لیے پہلی چیز جو مطلوب ہے وہ نماز کا قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ	جو کتابِ الٰہی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہیں اور
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ	جنھوں نے نماز قائم کی (تو وہی لوگ مصلح ہیں) اور ہم
الْمُصْلِحِيْنَ ۝ (۱۷۰۔ اعراف)	مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتاب اللہ یا بالفاظ دیگر عہدِ الٰہی پر قائم رہنا صرف ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جو نماز کو قائم کرنے والے ہوں اور دوسری بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور لوگوں کو اس پر مضبوطی کے ساتھ جمائے رکھنے کے لیے نماز قائم کریں درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اس زمین کی اصلاح کرنے والے ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی سعی اصلاح کا اجر پائیں گے۔

۳۰۔ صبر اور نماز اقامتِ دین کی جدّ و جہد میں وسیلۂ ظفر ہیں

نماز کی یہ اہمیت میثاقِ الٰہی کے پہلو سے بیان ہوئی ہے جس میں اس کے تابع کی حیثیت زکوٰۃ کو حاصل ہوئی ہے۔ اب ہم مختصر طور پر اقامتِ دین کی جدوجہد کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے جس میں اس کے پہلو بہ پہلو صبر کا ذکر آتا ہے اور جس کی طرف وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کی زیر بحث آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اقامتِ دین کی جدّوجہد میں کامیابی کا انحصار صبر اور نماز پر

قرآن حکیم میں تدبر کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں کامیابی کا انحصار اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں پر رکھا ہے۔ ایک صبر پر اور دوسرے نماز پر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے اندر اقامتِ دین کی جو جدوجہد شروع کی اس میں اپنی قوم کو انہی دو چیزوں سے مدد حاصل کرنے کی تلقین کی۔ فرمایا۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا (۱۲۸ - اعراف)

اور موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کی کہ اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔

اس آیت میں اگرچہ نماز کی بجائے اللہ کا لفظ آیا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا واحد ذریعہ نماز ہی ہے۔ چنانچہ دوسری آیات میں اس چیز کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اسی طرح مسلمانوں نے جب اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جد و جہد شروع کی اور اس راہ کی آزمائشوں سے انھیں سابقہ پیش آیا تو انھیں بھی صبر اور نماز ہی سے مدد حاصل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ٥ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ٥ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ٥ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۱۵۳ - ۱۵۷ - بقرہ)

اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں احساس نہیں ہوتا۔ اور ہم تمھیں آزمائیں گے کسی قدر خطرہ، بھوک اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور خوش خبری دو ان ثابت قدموں کو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کسی آزمائش سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ راہ یاب و بامراد ہونے والے ہیں۔

ٹھیک یہی تلقین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار مکی زندگی کے اس دور میں کی گئی ہے جب آپ نے اسلام کی دعوت بلند کی اور آپ کو ہر طرف سے مخالفوں اور معاندوں نے گھیر لیا۔ چنانچہ مکی سورتوں میں کفار و مشرکین کی مخالفت کے ذکر کے بعد بالعموم آپ کو ثابت قدم رہنے اور ساتھ ہی نماز پڑھنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس کی مثالیں اکثر سورتوں میں مل سکتی ہیں۔ ہم بخیالِ اختصار صرف چند آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں۔

فرمایا:۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (۱۳۰ - طٰہٰ)

پس جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ

پس صبر کرو ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں اور اپنے

بِحَمْدِ رَبِّكَ (۳۹۔ ق) — رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا — اور ثابت قدم رہو اپنے رب کے فیصلہ تک

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ — بے شک تم ہماری نگاہوں میں ہو اور اپنے رب کی حمد

تَقُومُ (۴۸۔ طور) — کے ساتھ اس کی تسبیح کرو جس وقت تم اٹھتے ہو۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ صبر اور نماز یہ دو ہتھیار ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حق و باطل کی کشمکش میں باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے دیے ہیں اور اگر ان دونوں کی فطرت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ دونوں باہم دگر ایک دوسرے کو غذا اور قوت بہم پہنچاتے ہیں۔ صبر سے نماز کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور نماز سے صبر کو غذا اور قوت ملتی ہے۔ نماز جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے، بڑی صبر طلب چیز ہے۔ جب تک کسی شخص میں صبر کی پختہ صفت موجود نہ ہو اس وقت تک وہ نماز کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا۔[1] اس پہلو سے صبر نماز کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اسی طرح صبر جس کی اصل حقیقت زندگی کے مراحل میں موقف حق پر ڈٹے رہنا ہے، کسی مضبوط سہارے کے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ مضبوط سہارا اگر کوئی ہو سکتا ہے تو خدا ہی کا سہارا ہو سکتا ہے، جو سب سے بہتر طریقہ پر نماز کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ (ثابت قدم رہو اور تمہارا ثابت قدم رہنا ممکن نہیں ہے مگر اللہ ہی کے سہارے سے) (۱۲۷۔ نحل)

مشکلات و مصائب کے مقابل میں اپنے موقف پر جمے رہنا، حوصلہ کو پست نہ ہونے دینا، ایک نہایت اعلیٰ وصف ہے جس کے بغیر نہ کسی فرد کی زندگی سنورتی ہے اور نہ کسی قوم کی زندگی بنتی ہے اس وجہ سے قومیں اپنے افراد کے اندر اس چیز کو پیدا کرنے کے لیے مختلف قسم کی تدبیریں اختیار کرتی ہیں۔ اس زمانے میں سب سے بہتر نسخہ اس کی تربیت کے لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ افراد کے اندر شہرت و ناموری کے جذبہ کو ابھارا جائے یا قومی عزت اور ناموس وطن کی رگ حمیت کو چھیڑا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک قسم کی گرمی دلوں کے اندر ان چیزوں سے بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ان کا پیدا کیا ہوا نشہ شراب کے نشہ کی طرح عارضی اور ناعاقبت اندیشانہ ہوتا ہے بر عکس اس کے مذہب انسان کے عزم و حوصلہ کی تربیت اس طرح کرتا ہے کہ ایک طرف اس کی زندگی کے ہر مرحلے کے

---

[1] استاذ امام کا خیال تو یہ ہے کہ اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ میں اصل مقصود نماز پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانے کی تاکید ہے۔ اس کے ساتھ صبر کا ذکر جو آیا ہے وہ محض اس لیے کہ اس کی حیثیت نماز کے لیے شرط اور ذریعہ کی ہے کیوں کہ نماز پر استقلال کے ساتھ جمے رہنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نماز کی مثال مولانا کے نزدیک ایک عظیم پل کی ہے جس کی تعمیر صرف ایک محکم بنیاد ہی پر ممکن ہے۔ مولانا کا استدلال وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر جم جاؤ ۱۳۲۔ طٰہٰ) اور اس مضمون کی بعض دوسری آیات سے ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر ذرا اس سے مختلف ہے۔

لیے ایک موقف حق معین کر دیتا ہے اور اس پر ڈٹ جانے کی تاکید کرتا ہے۔ دوسری طرف اس کو نماز کے واسطے سے آسمان و زمین کی سب سے بڑی طاقت سے جوڑ کر اس کو زندگی کا یہ ملکوتی نصب العین دے دیتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (کہہ دو، میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ ۱۶۲۔ انعام) غور کیجیے کہ حق پر استوار رہنے اور باطل سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو روح اس تربیت سے پیدا ہو سکتی ہے، وہ تمغے اور انعامات کی لالچ اور حب قومی و وطنی کے کھوکھلے نعروں سے پیدا ہو سکتی ہے؟

یہاں ایک لطیف نکتہ اور بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں نماز کا ذکر اقامتِ دین کی جدوجہد کے وسیلہ یا ہتھیار کی حیثیت سے ہوا ہے وہاں اوّل تو اس کے ساتھ صبر کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ ثانیاً صبر کا ذکر ہر جگہ نماز پر مقدم ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق کو قائم کرنے اور باطل کو شکست دینے کی جدوجہد میں مقدم شے جو مطلوب ہے وہ مردانہ اقدام اور راہِ حق میں عزیمت و استقامت ہے۔ آدمی اگر اپنے اس جوہر کو نمایاں کرے اور ساتھ ہی نماز کا اہتمام کرے تو اس کے اس جوہر کو جلا ملتی ہے اور راہ حق کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا سینہ کھلتا اور اس کا دل ایمان و یقین سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن آدمی اگر اپنے ارادے اور عزم کو کوئی حرکت نہ دے، صرف کسی حجرے میں بیٹھا ہوا اللہ ہو کا ورد کرتا رہے تو یہ نماز زیر بحث مقصد کے لیے بالکل غیر مفید ہے۔

۳۱۔ مجموعۂ آیات ۴۰۔۴۶ کی ایک خاص تعلیم اصلاح ملت کے نقطۂ نظر سے

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات سے جو عام تعلیمات و ہدایات نکلتی ہیں بقدر ضرورت ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔ اب ہم ایک خاص حقیقت کی طرف توجہ دلائیں گے جو انہی آیات سے نکلتی ہے اور اصلاحِ امت کے نقطۂ نظر سے جس کی بڑی اہمیت ہے۔

اوپر کی فصلوں میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ نماز کو میثاقِ خداوندی کے اندر ایمان کے بعد اولین اہمیت حاصل ہے اور یہ بات بھی بیان ہو چکی ہے کہ میثاقِ خداوندی کی تجدید کی جدوجہد میں بھی نماز ہی در حقیقت روح اور وسیلۂ ظفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اعراف کی آیت ۱۷۰ اَلَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ کی روشنی میں ہم یہ بات بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کو جو اصل میثاق ہے، پوری مضبوطی سے تھاما جائے، اس پر خود قائم ہو کر دوسروں کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور کسی حال میں بھی یہ حبل اللہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ دی جائے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اولین عہد کی حیثیت سے بھی اور وسیلۂ ظفر اور ذریعہ کامیابی ہونے کے پہلو سے بھی نماز کے قائم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ قرآن کے نزدیک یہی اصلاح کا راستہ ہے اور جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں وہی لوگ ملت کے حقیقی مصلح ہیں جن کا اجر اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا۔

قرآن حکیم کا یہ بیان تجدید دین و اصلاح ملت کی تمام تحریکات اور تمام دعوتوں کے جانچنے کے لیے ایک کسوٹی فراہم کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہ دعوت یا تحریک اصلاح ملت کی صحیح دعوت یا تحریک ہے جس کے مبداء و معاد، جس کی ابتدا اور انتہا، جس کے عقیدہ اور عمل، جس کے نصب العین اور پروگرام دونوں میں نماز اور اقامتِ نماز کو وہی اولیت و اہمیت حاصل ہو جو اللہ کے عہد اور اس کی اقامت کی جدوجہد میں فی الواقع از روئے قرآن اس کو حاصل ہے۔ جس دعوت یا تحریک میں نماز کو یہ اولیت و اہمیت حاصل نہ ہو وہ تجدید دین اور اصلاح ملت کے نقطۂ نظر سے ایک بے برکت بلکہ لاحاصل کام ہے، کیونکہ وہ اس ریڑھ کی ہڈی سے بھی محروم ہے جس پر تجدید دین کی دعوت کا قالب کھڑا ہوتا ہے اور اس روح سے بھی محروم ہے جس سے اس قالب کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔

۳۲۔ آگے کا مضمون —— آیات ۴۷-۶۲

آگے یہود کو از سرِ نو مخاطب کر کے پہلے تو ایک مختصر تمہید میں ان کو اس بات کی یاد دہانی کی گئی ہے کہ فضیلت و بزرگی تمہیں جو کچھ بھی حاصل ہوئی ہے محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئی ہے۔ اس میں نہ تو تمہارے استحقاق کو کوئی دخل ہے، نہ تمہارے خاندانی شرف کو۔ اس وجہ سے اس قسم کے کسی وہم یا گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس دعوتِ حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے سامنے پیش کی گئی ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ ایک دن آنے والا ہے جس میں تمہیں اپنے اعمال کی خود ہی جواب دہی کرنی ہے، تمہارے فرائض سے متعلق نہ تو دوسروں سے سوال ہوگا اور نہ دوسرے تمہاری طرف سے کوئی جواب دہی کریں گے۔

یہود کے سامنے تین حقیقتوں کی وضاحت

اس کے بعد بنی اسرائیل کی ابتدائی تاریخ کے چند اہم واقعات کے حوالے دے کر ان کے سامنے تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جتنے بھی انعامات کیے ہیں سب تمہاری ناشکریوں کے باوجود محض اپنے فضل و کرم سے کیے ہیں۔ تمہاری پوری تاریخ شاہد ہے کہ تم نے اپنی ناسپاسی اور ناشکری کے سبب سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے لیکن اس نے تمہارے اس کفرانِ نعمت کے باوجود تم کو اپنے احسانات سے نوازا ہے۔ اس وجہ سے تمھیں اپنے تقدس و تقرب کا بہت زیادہ غرور نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری یہ کہ تم کو جو نعمت بھی خدا نے بخشی ذمہ داریوں اور فرائض کے ساتھ بخشی، خاندانی وراثت کے طور پر نہیں بخشی، چنانچہ تمہاری تاریخ گواہ ہے کہ جب جب تم نے کسی نعمت کا حق ادا کرنے اور اس سے پیدا ہونے والی ذمہ داریاں پوری کرنے میں کوتاہی کی ہے تم پر مار بھی بڑی ہی سخت پڑی ہے۔

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کو بھی کوئی شرف یا تقرب اس کے ذاتی یا خاندانی استحقاق یا کسی گروہ کے ساتھ نسبت رکھنے کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور عمل صالح کی بنا

پر حاصل ہوتا ہے۔

یہ سارا مضمون آیت ۴۷ سے شروع ہو کر آیت ۶۲ پر ختم ہوتا ہے اور مقصود اس ساری تفصیل سے بنی اسرائیل کی ان بیماریوں کو دور کرنا ہے جن کے سبب سے قرآن کی دعوت ان کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بن گئی تھی۔

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ فرمایا:

آیات ۴۷-۶۲

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾ ع وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى
لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا
مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ
يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ
لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا
وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ
خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ
الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

ترجمۂ آیات ۴۷ - ۶۲

اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا والوں پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی، نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔ ۴۷ - ۴۸

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آل فرعون کے قبضہ سے چھڑایا۔ وہ تمھیں برے عذاب چکھاتے تھے، تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی۔ ۴۹

اور یاد کرو جب کہ ہم نے دریا کو پھاڑ کر تمھیں پار کرایا، پس تمھیں نجات دی اور آل فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے رہے۔ ۵۰

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنے والے ہو۔ پھر ہم نے تم سے درگزر کیا اس کے بعد تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۵۱ - ۵۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فرقان تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ ۵۳

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنے مجرموں کو اپنے ہاتھوں قتل کرو، یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے تو اس

نے تمھاری توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والااور رحم فرمانے والا ہے۔ ۵۴

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا کہ اے موسیٰؑ، ہم تمھارا یقین کرنے والے نہیں ہیں، جب تک ہم خدا کو کھلّم کھلا دیکھ نہ لیں تو تم کو کڑک نے آدبوچا اور تم دیکھتے رہ گئے۔ پھر ہم نے تمھاری موت کے بعد تمھیں اٹھایا تاکہ تم شکر گزار بنو۔ اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارے، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ۵۵، ۵۷

اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا، داخل ہو جاؤ اس بستی میں، پس کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ اور داخل ہو دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور دعا کرو کہ اے رب! ہمارے گناہ بخش دے، ہم تمھارے گناہ بخش دیں گے اور اچھی طرح حکم بجالانے والوں پر ہم مزید فضل کریں گے تو جنھوں نے ظلم کیا انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے پس ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے ظلم کیا ان کی نافرمانی کے سبب سے آسمان سے عذاب اتارا۔ ۵۸،۵۹

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا اپنی لٹھیا پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور نہ بڑھو زمین میں فساد مچانے والے بن کر۔ ۶۰

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے تو اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے ان چیزوں میں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے اپنی سبزیوں، ککڑیوں، لہسن، مسور اور پیاز میں سے۔ کہا، کیا تم اعلیٰ کو ادنیٰ سے بدلنا چاہتے ہو؟ کسی شہر میں اترو تو وہ چیز تمھیں ملے گی جو تم نے طلب کی ہے اور ان پر ذلّت اور پست ہمتی

تھوپ دی گئی اور وہ خدا کا غضب لے کر لوٹے، یہ اس سبب سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار
کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے
بڑھ جانے والے تھے۔ ۶۱

بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی۔ ان میں سے جو اللہ اور
روز آخرت پر ایمان لایا اور جس نے عمل صالح کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے
اور ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۶۲

۳۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ (۴۷)

بنی اسرائیل کی فضیلت کی نوعیت

لفظ نعمت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ یہاں اس پر وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ کو عطف کیا ہے۔
یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس اجمال کی وضاحت کر رہا ہے جو نعمت کے لفظ کے اندر موجود ہے۔ اس
فضیلت سے مراد قوموں کی ہدایت و رہنمائی کا وہ منصب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک
خاص دور میں منتخب فرمایا۔ جو فضیلت کسی منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، وہ ایک مشروط
فضیلت ہوتی ہے۔ اگر صاحب منصب قوم اس ذمہ داری کو ادا کرتی ہے تو یہ فضیلت اس کو حاصل رہتی ہے
اور اگر اس کو چھوڑ بیٹھتی ہے تو صرف اس فضیلت ہی سے محروم نہیں ہو جاتی جو اسے بخشی گئی تھی بلکہ
کفرانِ نعمت کی پاداش میں اس کو مزید براں ذلت بھی نصیب ہوتی ہے۔ یہاں بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی
گئی ہے کہ جس فضیلت پر تمھیں ناز ہے وہ فضیلت خدا ہی کی عطا کردہ تھی، اگر اس کو باقی رکھنا چاہتے ہو
تو خدا کے عہد پر قائم رہو اور اس کا حق ادا کرو۔ خدا کے عہد سے نکل کر تم اس فضیلت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔
قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بنی اسرائیل کے منتخب کیے جانے کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی
ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:- وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۳۲- دخان (اور ہم نے ان کو دنیا والوں
کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا، دیکھ بھال کر) یہاں "علیٰ علم" کے الفاظ سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ انتخاب کسی
اندھے کا انتخاب نہیں تھا کہ جس پر ہاتھ پڑ گیا اس کو اس نے منتخب کر دیا۔ بلکہ یہ کام ایک صاحب علم و بصیرت
نے کیا ہے جو اپنے علم و بصیرت سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کب یہ اس منصب کے اہل ہیں اور کب نہیں ہیں۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۴۸)

جَزٰی عَنْہُ کے معنی ہیں، اس کی طرف سے ادا کردیا، یا اس کی طرف سے کافی ہوگیا۔ لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا کے معنی ہوں گے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہ آسکے گا جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہوگی کوئی دوسرا اس کی طرف سے وہ ادا نہ کرسکے گا۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے مثلاً وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ [1] (اور کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گی) وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا [2] (اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی باپ اپنی اولاد کے کام نہ آسکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا) اس دن ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (۳۷۔عبس)

'شفاعت' کا مفہوم

شفاعت، شفع سے ہے۔ شَفَعَ الشَّیءَ کے معنی ہیں، اس کے ساتھ اسی طرح کی چیز کو ملا کر اس کو جوڑا کر دیا۔ شفع لفلان یا شفع فیہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی بات یا درخواست کے ساتھ کوئی شخص اپنی تائید یا سفارش ملا کر اس کو مؤید کردے۔

عدل کے معنی انصاف کے ہیں۔ فرمایا اَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ [3] (یہ کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو) پھر یہیں سے یہ لفظ مساوی اور برابر کے معنی میں استعمال ہوا۔ فرمایا اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا [4] (یا اس کے برابر روزے) نیز فدیہ کے معنی میں استعمال ہوا کیوں کہ فدیہ جس کا فدیہ ہوتا ہے اس کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ میں عربی زبان کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس میں بظاہر تو ایک شے کے لازم کی نفی ہوتی ہے لیکن مقصود درحقیقت ملزوم کی نفی ہوتی ہے۔ امراء القیس نے اپنے ایک شعر میں ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ لا یھتدی بمنارہ (اس کی برجیوں سے رستہ معلوم نہیں کیا جاتا) ظاہر ہے کہ اس طرز تعبیر سے اس کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اس صحرا میں رہنمائی کے لیے برجیاں اور منارے سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ اسی اسلوب پر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن نہ کوئی ان کے لیے شفاعت کرنے والا ہوگا، نہ کوئی شفاعت قبول ہوگی، نہ کسی کے پاس دینے کے لیے معاوضہ ہوگا، نہ کسی سے معاوضہ لیا جائے گا، نہ کسی کے حامی اور مددگار ہوں گے، نہ کسی کی حمایت و مدد کی جاسکے گی۔ یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان ہوئی ہے فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ [5] (پس ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہیں دے گی) اور پھر دوزخیوں کی زبان سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ [6] (نہ ہمارے کوئی سفارش کرنے والے ہیں اور نہ سرگرم دوست)

---

[1] ۱۶۴۔انعام [2] ۳۳۔لقمان [3] ۵۸۔نساء [4] ۹۵۔مائدہ [5] ۴۸۔مدثر [6] ۱۰۰۔شعراء

بنی اسرائیل کو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے انبیاء کی اولاد میں سے ہونے کا جو گھمنڈ تھا اور جس کی بنا پر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کی نجات کے لیے ان بزرگوں کی نسبت اور سفارش ہی کافی ہوگی، یہ آیت ان کے اس واہمہ کی جڑ کاٹ رہی ہے اور ان کو اس بات کی یاددہانی کر رہی ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی اصل چیز عہد الٰہی کی پابندی اور ایمان و عمل صالح ہے۔ اس سے بے پروا ہو کر محض آرزوؤں کے ہوائی قلعہ پر اعتماد نہ کرو۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۴۹)

آل کا مفہوم آلِ فرعون، یعنی قوم فرعونؑ۔ آل سے مراد صرف کسی شخص کی اولاد نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ لفظ آل واولاد، قوم وقبیلہ اور اتباع و انصار سب پر حاوی ہے۔

نابغہ ذبیانی کا شعر ہے:

من آل میه رایح او مغتدی عجلان ذا زاد و غیر مزود

میرے قبیلہ کے لوگوں میں کوئی صبح روانہ ہوا کوئی شام، کوئی زاد راہ کے ساتھ، کوئی بغیر زاد راہ کے۔

سورہ مومن ۴۵ میں ہے، وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ (اور آل فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا) سورۂ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ ۱۳۰ (اور ہم نے آل فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا)

ان آیات میں جس عذاب کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ فرعون اور اس کی ساری قوم ہی پر آیا، نہ کہ صرف اس کی اولاد پر، اس کی اولاد کا تو کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ اس کا بے اولاد ہونا ثابت کرتے ہیں۔ تورات میں یہ ذکر ضرور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں دریا سے جس نے نکلوایا تھا وہ فرعون کی لڑکی تھی لیکن قرآن نے اس غلطی کی بھی تصحیح کر دی ہے کہ یہ اس کی لڑکی نہیں بلکہ اس کی بیوی تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (اور فرعون کی بیوی نے کہا، یہ میری اور تمھاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اس کو قتل نہ کرو، ممکن ہے ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں اور وہ اس بات کے انجام کا احساس نہیں رکھتے تھے)

سُوم کے معنی سُوم کے معنی کسی پر کوئی بوجھ یا بار ڈالنے کے ہیں، کہیں گے سامہٗ ظلما و سامہٗ خسفا اس کو ظلم کا یا ذلت کا مزہ چکھایا۔ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ (وہ تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور

لہ لفظ آل کی یہ تحقیق مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔ ۲ہ ۹ قصص

تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے) یہ اس عذاب ظلم و ذلت کی تفصیل ہے جس میں فرعونیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔ اگرچہ مصر میں بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے تھے اور بے شمار قسم کی ذلتوں سے انہیں سابقہ تھا جن کی تفصیل ان کی تاریخ میں موجود ہے لیکن یہاں ذکر صرف دو ہی باتوں کا بطور نمونہ فرمایا ہے، ان نمونوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل وہاں کس شکنجہ میں تھے۔

بلاغت کا ایک نکتہ

بیٹوں کے قتل کے اسباب اور اس کی نوعیت کی تفصیل تو کسی موزوں مقام پر آئے گی یہاں البتہ بلاغت کا ایک نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ لڑکوں کے ذبح کا ذکر جو کیا ہے تو (ابناء) بیٹوں کے لفظ سے کیا ہے تاکہ شفقت پدری کا جذبہ ابھرے اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کا ذکر کیا ہے تو ان کے لیے (نساء کم) تمھاری عورتوں کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے کہ غیرت کو حرکت میں لانے کے لیے یہ تعبیر زیادہ موثر تھی۔

وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی) اس آزمائش کے کٹھن ہونے کی طرف یہاں اشارہ اس لیے فرمایا کہ اس نجات کی اہمیت کا انھیں کچھ اندازہ ہو سکے جو انھیں حاصل ہوئی کہ کیسا عظیم ابتلا تھا جس سے ان کے رب نے ان کو چھڑایا، اگر وہ نہ چھڑاتا تو کوئی دوسری طاقت اس عذاب سے ان کو نہیں چھڑا سکتی تھی۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۵۰)

فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم نے تمھیں ساتھ لے کر دریا کو پھاڑتے ہوئے عبور کیا، مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح کوئی کسی کو گود میں اٹھا کر دریا پار کرا دے اسی طرح ہم نے تمھیں پار کرایا۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، یعنی اپنی نجات کے بعد فرعون اور اس کے غرق ہونے کا ماجرا تم نے ساحل پر کھڑے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

واقعات کو پیش کرنے کی ایک مخصوص نوعیت

یہاں تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں ان کے متعلق دو باتیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ یہ تمام واقعات بنی اسرائیل کی تاریخ کے نہایت اہم اور مشہور واقعات ہیں جن سے ان کا بچہ بچہ واقف تھا اس وجہ سے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی، صرف اشارات کافی تھے۔

دوسری یہ کہ زمانۂ نزول قرآن کے بنی اسرائیل ان واقعات کو اپنی تاریخ کے واقعات کی حیثیت سے نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان پر فخر کرتے تھے اس بنا پر قرآن نے ان واقعات کو ان کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے گویا یہ انھیں کے ساتھ پیش آئے ہیں، یہ بلیغ اسلوب بیان اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے نہایت موثر اور مفید ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِہٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۵۱) ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۵۲)

یہ اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر چکنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام

سے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات دینے کے لیے فرمایا اور اس مقصد کے لیے ان کو طور پر بلایا۔ یہ چالیس دن کی مدت اس قلبی و روحانی تیاری کے لیے تھی جو کتاب الٰہی کے بارِ عظیم کے متحمل ہونے کے لیے ضروری تھی۔ ابتداءً یہ وعدہ تیس دنوں کا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ ان کی اس جلدی کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تربیت مقتضی ہوئی کہ یہ مدت ۳۰ دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی جائے مذکورہ آیت میں یہ پوری مدت جمع کر دی گئی ہے۔ سورۂ اعراف میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً (اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس راتیں بڑھا کر۔ اس طرح اس کے رب کی مقررہ مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی)

گوسالہ پرستی کا واقعہ

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ: یعنی موسیٰ کے پہاڑ پر چلے جانے کے بعد تم دھات کا ایک بچھڑا بنا کر اس کی پرستش میں لگ گئے۔ کتاب خروج باب ۳۲ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں لیکن یہود نے اپنی عادت کے مطابق اس میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی ملوث کر دیا ہے جس کی قرآن نے دوسرے مقام پر تردید فرمائی ہے:

> اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیوں کہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ . . . . تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا کیوں کہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال لایا بگڑ گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ گردن کش قوم ہے اس لیے تو مجھے چھوڑ دے کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں ان کو بھسم کر دوں (باب ۳۲۔ آیات ۱۔۷)

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ: یعنی اس گوسالہ پرستی کا ارتکاب کر کے تم نے خود اپنی جانوں پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ چنانچہ دو ہی آیتوں کے بعد قرآن نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ (اے میری قوم کے لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا) ظلم کی اصل حقیقت حق تلفی کرنا ہے۔ شرک کا ارتکاب کر کے انسان اپنے نفس کی سخت تحقیر کرتا ہے کیونکہ وہ خدا کا خلیفہ اور تمام مخلوقات سے اشرف ہونے کے باوجود اپنے ہی جیسی یا اپنے سے بھی کسی گھٹیا مخلوق کو اپنا خدا بنا بیٹھتا ہے۔ اپنے نفس کی اس سے بڑی حق تلفی اور کیا ہو سکتی ہے؟

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: (۵۳)

فرقان کا مفہوم

فرقان کے معنی ہیں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز یہاں واؤ بیان اور تفسیر کے لیے ہے۔

یعنی کتاب (تورات) ہی کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کر کے اس کے ایک اور پہلو کو واضح کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں قرآن اور تورات دونوں کے لیے فرقان کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ ۴۸۔ انبیاء (اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دی) اسی طرح قرآن مجید کے متعلق ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ ۱۔ الفرقان (بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا)

ان کتابوں کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کرنے میں کئی پہلو مدِ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تمام احکام و ہدایات کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ حق و باطل اور حرام و حلال کے درمیان امتیاز کرتی ہیں۔ تیسرا یہ کہ اپنے مدعا و مقصد میں بالکل واضح ہیں۔ چوتھا یہ کہ ان سے انسان کو وہ حکمت حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے تمام نشیب و فراز میں خیر و شر کی شناخت کے لیے روشنی بخشتی ہے۔

قرآن نے معرکۂ بدر کو بھی فرقان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ اس نے بھی حق و باطل کو اچھی طرح آشکارا کر دیا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۵۴)

لفظ بوء کا مفہوم

برء کا مفہوم لفظ خلق کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک ہی جگہ اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں بیان ہوئی ہیں (هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ) خلق کا مفہوم ہے کسی چیز کا خاکہ design تیار کرنا۔ برء کا مفہوم ہے اس کو ٹھیک ٹھاک کرنا، تصویر کے معنی ہیں اس کو مکمل کرنا۔ اس اعتبار سے اگرچہ خالق اور باری دونوں لفظوں کے لغوی مفہوم میں ایک باریک سا فرق ہے لیکن عام استعمال میں دونوں ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں۔

'فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ' کا مطلب

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، پس اپنے آپ کو قتل کرو کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنی تلواریں خود اپنی گردنوں پر چلا دو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنۂ شرک و گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں اپنے اپنے قبیلہ کے ان لوگوں کی گردنیں اپنے ہاتھوں سے ماریں جنھوں نے قوم کے لیے اس فتنۂ ارتداد کی راہ کھولی ہے۔ یہ حکم دینے میں چند عظیم مصلحتیں تھیں۔

ایک یہ کہ اس طرح اس توبہ نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کر لی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے کاٹ پھینکا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توحید کی اہانت کی تھی۔

دوسری یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہت پورے طور پر واضح ہو گئی۔ گویا شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر آدمی کا بایاں ہاتھ اس کا ارتکاب کرے تو اس کے داہنے ہاتھ کا فرض ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دے۔ اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت اور رواداری کو دخیل ہونے دے

اور نہ کسی قرابت اور رشتہ داری کا لحاظ کرے۔

تیسری یہ کہ ہر قبیلہ و خاندان کے اخیار اگر اپنے اپنے قبیلوں کے اشرار پر تلوار اٹھائیں گے تو اس سے خاندانی اور قبائلی عصبیت نہیں ابھرے گی بلکہ بغیر کسی فتنہ کے اندیشہ کے بنی اسرائیل کی تطہیر ہو جائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی تقریب قریب یہی بات نکلتی ہے۔ چنانچہ کتاب خروج میں ہے۔

"جب موسیٰؑ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے کیوں کہ ہارون نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں[1] کے درمیان ذلیل کر دیا تو موسیٰؑ نے لشکرگاہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی طرف ہے (یعنی عہد توحید پر قائم ہے) وہ میرے پاس آ جائے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہو گئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر، پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکرگاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ اور بنی لاوی نے موسیٰؑ کے کہنے کے موافق عمل کیا چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰؑ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو (یعنی عہد توحید کی تجدید کرو) بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔" (باب ۳۲۔ آیات ۲۵۔۳۰)

اگرچہ توریت کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرتدوں کے قتل کے کام پر صرف بنی لاوی کو مامور کیا تھا لیکن خود مذکورہ اقتباس کا آخری حصہ شہادت دے رہا ہے کہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی ہر قبیلہ کے موحدین اس کام پر مامور کیے گئے کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے مرتدوں کی گردنیں ماردیں تاکہ یہ اہل ایمان کے مزید ایمان کی ایک شہادت ہو اور لوگ سبق حاصل کریں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس معاملہ میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو بھی معاف کرنے والا نہیں ہے۔

تاریخ اسلام میں، یاد ہو گا، اسی قسم کا مشورہ حضرت عمرؓ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق دیا تھا۔

اس حکم سے ایک بات تو یہ نکلتی ہے کہ توبہ کی قبولیت کے لیے اصل گناہ سے پوری پوری بیزاری ضروری ہے۔ دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ جو برائی معاشرہ کے ذمہ داروں کی غفلت سے معاشرہ میں پھیل جائے اس کا کفارہ سب کو ادا کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ جرم معاف نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ نکلتی ہے کہ ارتداد کی سزا حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں بھی قتل ہی تھی۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ: یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ یعنی تمہیں تو بظاہر یہ ایک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑا قومی نقصان معلوم ہو گا کہ قوم کے اتنے بڑے حصہ کو قومی جسم سے کاٹ کر پھینک دیا جائے لیکن تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک اس حصہ کے کاٹ پھینکے جانے

---

[1] یہود نے حضرت ہارونؑ کو بدنام کرنے کے لیے تورات میں اس قسم کے جو اضافے کیے ہیں ان کی تردید ہم مناسب موقع پر کریں گے۔

ہی میں تمھارے لیے دین و دنیا کی خیر و برکت ہے۔ اگر خاندانی جذبات اور قومی محبت کے جوش میں تم نے اس فاسد حصّہ کو اپنے وجود قومی کے ساتھ چپٹائے رکھنے ہی کو بہتر سمجھا تو یاد رکھو کہ اس کا فساد تمھارے سارے وجود قومی کو فاسد کر کے چھوڑ دے گا۔ اصول و عقائد سے بنی ہوئی ایک جماعت کے ساتھ اگر ان اصولوں کے مخالف بھی محض نسلی تعلق کی بنا پر چپکے رہیں تو وہ پوری جماعت تباہ ہو کے رہتی ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۵۵)

بنی اسرائیل کی شک پرستانہ ذہنیت

ہم تمھارا یقین اس وقت تک نہیں کرنے کے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ بنی اسرائیل شک کے ایسے مریض تھے کہ انھیں کسی طرح یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ سے کلام بھی کرتا ہے اس وجہ سے جب موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے کہ خداوند تمھیں یہ یہ حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ جب خدا تم سے کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم بھی اس کو آنکھوں سے دیکھیں، اس کے بغیر ہم تمھاری بات کی صحت کس طرح تسلیم کر لیں؟

جہاں تک اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کا تعلق ہے، یہ خواہش کوئی قابلِ ملامت خواہش نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ خواہش کی تھی لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ یہ خواہش شرحِ صدر اور اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے ہو اور اس بات میں کہ اس کو انکار اور تکذیب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے تاکہ آخرت کے باب میں انھیں پورا پورا شرحِ صدر حاصل ہو جائے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملامت نہیں فرمائی بلکہ صرف یہ فرمایا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے، صرف میری صفات ہی کو دیکھ سکتے ہو۔ قرآن مجید میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَہٗ	اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر آیا اور
رَبُّہٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ	اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا کہ اے
قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ	خداوند تو مجھے اپنے آپ کو دکھا، میں تجھے دیکھوں گا، فرمایا
فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ	تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی
تَرٰىنِیْ ج فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ	جگہ پر ٹھہرا رہ سکے تو تم مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے
جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ج	رب نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو اس کو پاش پاش کر دیا
فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَکَ	اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو
تُبْتُ اِلَیْکَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔	بولے اے رب تو پاک ہے، میں نے توبہ کی اور میں
(۱۴۳۔ اعراف)	پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

برعکس اس کے بنی اسرائیل کے لوگوں کا یہ مطالبہ محض ان کی بے یقینی اور شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا اور یہ مظاہرہ وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود قدم قدم پر کرتے رہتے تھے اس وجہ سے ان پر عتاب ہُوا۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہ عتاب یہاں فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اور سورۂ اعراف ۱۵۵ میں فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ کے الفاظ سے لفظ صاعقہ کی تحقیق ہم سترھویں فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔ رجفہ کے معنی زلزلہ کے ہیں۔ ایک ہی واقعہ سے متعلق قرآن نے دو مقامات میں جو بظاہر دو الگ الگ لفظ استعمال کیے ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ ایک ہی حادثہ کے دو مختلف اثرات ہیں جو بیک وقت ظاہر ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشاہدہ کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی جب پہاڑ پر ڈالی تو جس طرح پہاڑ پاش پاش ہو گیا اسی طرح بنی اسرائیل کے مطالبہ پر جب اس کی تجلی ظاہر ہوئی ہے تو وہ صاعقہ کی شکل میں نمودار ہوئی جس نے سارے پہاڑ میں زلزلہ ڈال دیا اور یہ لوگ بھوچکے ہو کر گر پڑے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵۶)

موت کا مفہوم

اس صاعقہ اور زلزلہ سے ان ستر سرداروں پر جو اس موقع پر[1] حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے تھے جو حالت طاری ہوئی، قرآن مجید نے اس کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس موت سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بطریق استعارہ بے ہوشی بھی۔ عربی زبان میں موت کا لفظ استعارہ کے طور پر نیند اور بے ہوشی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے[2]۔ چنانچہ سو کر اٹھنے کے بعد کی جو مشہور دعا احادیث میں نقل ہوئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں، الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور (اس اللہ کے لیے شکر ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے) اسی طرح بعثت کا لفظ بھی اصحابِ کہف کے واقعہ میں ان کو نیند سے بیدار کرنے کے

---

[1] قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اس موقع کی بات ہے جب گوسالہ پرستی کے حادثہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ستر منتخب آدمیوں کو لے کر طور پر اس مقصد سے گئے ہیں کہ اپنی قوم کے لیے معافی مانگیں اور اس کام میں اپنی قوم کے ان لیڈروں کو بھی شریک کریں۔

[2] لسان العرب میں ہے، مات الرجل وھمد وھوّم اذا نام .... الموت السکون وکل ما سکن فقد مات .... وفی حدیث دعاء الانتباہ: الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور سمی النوم موتا لانہ یزول معہ العقل والحرکۃ تمثیلا وتشبیہا لا تحقیقا وقیل الموت فی کلام العرب یطلق علی السکون یقال ماتت الریح ای سکنت ومنہا المنام لقولہ تعالیٰ والتی لم تمت فی منامہا وقد قیل المنام الموت الخفیف والموت النوم الثقیل .... والموتۃ جنس من الجنون والصرع یعتری الانسان فاذا افاق عاد الیہ عقلہ کالنائم والسکران۔ والموتۃ الغشی۔

لیے استعمال ہوا ہے۔

اگرچہ بنی اسرائیل اپنی سرکشی کے سبب سے سزاوار تو اسی بات کے تھے کہ ان کو دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ان کو مزید مہلت بخشی اور ان کے پیغمبر نے بھی اس موقع پر ان کے لیے بڑی دل سوزی کے ساتھ دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ سورہ اعراف میں اس کا حوالہ اس طرح آیا ہے۔

وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا	اور موسیٰ نے ہمارے مقررہ وقت پر حاضری کے لیے
لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ	اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب کیے تو جب ان کو زلزلے نے
قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ	آ پکڑا تو موسیٰ نے دعا کی کہ اے رب اگر تو چاہتا تو ان کو
قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا	اور مجھ کو پہلے ہی ہلاک کر چھوڑتا، کیا تو اس جرم میں ہم سب
فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا	کو ہلاک کر دے گا جو ہم میں سے بے وقوفوں نے کیا ہے
فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاۗءُ	یہ تو بس تیری آزمائش تھی، اس کے ذریعے سے تو جس کو
وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا	چاہے گمراہ کرے اور جس کو چاہے ہدایت دے تو ہمارا
فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ	مددگار ہے۔ تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین
الْغٰفِرِيْنَ (۱۵۵۔ اعراف)	بخشنے والا ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۵۷)

یہ ان انعامات کا بیان ہے جو بنی اسرائیل پر صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دھوپ اور فاقے کی مصیبت سے بچانے کے لیے کیے۔

من کی تحقیق

مَن کے اصل معنی فضل و احسان کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ خاص غذا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے صحرائے سینا میں خاص اپنے فضل سے مہیا فرمائی، جس کے لیے نہ انھیں ہل چلانے پڑے، نہ تخم ریزی اور آب پاشی کی زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ تورات میں اس کی تفصیل اس طرح بیان ہوئی ہے۔

"اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خیمہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب اوس جو پڑی ہوئی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے مَن؟ کیوں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے ...... اور وہ ہر صبح کو اپنے اپنے کھانے کی مقدار کے مطابق جمع کر لیتے تھے اور دھوپ تیز ہوتے ہی وہ پگھل جاتا تھا۔" خروج باب ۱۶۔ ۱۳-۲۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کی طرح ایک چیز زمین پر ٹپکتی تھی اور پالے کے دانوں کی طرح وہ جم جاتی

تھی۔ آفتاب کی تمازت بڑھنے سے پہلے پہلے اس کا جمع کر لینا ممکن ہوتا تھا۔ تمازت بڑھنے کے بعد یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ چونکہ یہ نعمت، جیسا کہ عرض کیا گیا، بغیر کوئی زحمت و مشقت اٹھائے حاصل ہوئی تھی اور ایک ایسے بے آب وگیاہ صحرا میں حاصل ہوئی تھی جہاں فراہمی غذا کے اسباب و وسائل مفقود تھے اس وجہ سے اس کا نام مَنّ قرار پایا (یہ واضح رہے کہ عربی اور عبرانی دونوں قریب الماخذ زبانیں ہیں)

مَنّ کے وجہ تسمیہ سے متعلق یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے لیکن تورات کا مذکورہ بالا اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب اس عجیب و غریب چیز کو دیکھا تو ان کے اندر یہ سوال پیدا ہوا کہ مَنْ هُوَ یہ کیا ہے؟ ان کے اسی سوال سے اس کا نام مَن پڑ گیا۔ ہمارے نزدیک یہ وجہ تسمیہ محض یہود کی بد مذاقی کی ایک ایجاد ہے۔ نہ لفظ اس کی تائید کرتا ہے، نہ عقل سلیم اس کو قبول کرتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس چیز کو جو روٹی سے تعبیر فرمایا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سچ مچ یہ روٹی کی قسم کی کوئی چیز تھی، بلکہ روٹی یہاں غذا کے مفہوم میں ہے۔ غذا کے مفہوم کی تعبیر کے لیے یہ لفظ قدیم صحیفوں میں بہت استعمال ہوا ہے۔ ہمار ی زبان میں بھی یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

'سَلوٰی' کی تحقیق

سَلوٰی: ۔ مَن کی طرح لفظ سلویٰ بھی عربی میں اہل کتاب کے واسطہ سے آیا ہے اور اہل عرب نے اس کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ ان پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے۔ یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے، اور بٹیروں ہی کی طرح ان کا شکار نہایت آسان تھا۔ خروج میں ان کی تفصیل اس طرح آئی ہے:۔

"پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت ملک مصر سے نکلنے کے بعد دوسرے مہینے کی پندرھویں تاریخ کو سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰ اور ہارون پر بڑبڑانے لگی، اور بنی اسرائیل کہنے لگے کاش کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیئے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے کیونکہ تم تو ہم کو اس بیابان میں اسی لیے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو ..... اور خداوند نے موسیٰ سے کہا، میں نے بنی اسرائیل کا بڑبڑانا سن لیا ہے۔ سو تو ان سے کہہ دے کہ شام کو تم گوشت کھاؤ گے اور صبح کو تم روٹی سے سیر ہو گے اور تم جان لو گے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا (خروج باب ۱۶ : ۱-۱۳)

كُلُوا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ: (کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں) اس طرح کے مواقع پر عام طور پر ہمارے مفسرین قلنا کا لفظ محذوف مانتے ہیں۔ یعنی ہم نے یہ چیزیں ان کو بخشیں اور کہا کہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو ہم نے بخشی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع پر 'کہا' کا لفظ محذوف کر دینے میں ایک خاص بلاغت ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اپنی صورت و ہیئت یا بالفاظ دیگر اپنی زبان حال سے

بھی یہ دعوت دیتی ہے کہ اس نعمتِ الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے پروردگار کے شکر گزار رہو۔ یہ اشارات قرآن مجید میں کہیں کہیں کھول دیئے گئے ہیں اور بعض جگہ (جیسا کہ یہاں ہے) مخفی چھوڑ دیئے گئے ہیں جن کے اندر اس کائنات کی پھیلی ہوئی نعمتوں کی اشارات سمجھنے والی عقل ہوتی ہے، وہ ان اشارات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

یہاں کلام کا سیاق و سباق اس امر کو واضح کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کا حق نہیں پہچانا۔ وہ ان نعمتوں کو پا کر شکر گزار بننے کے بجائے ان کی ناقدری اور خدا کی نافرمانی کرتے رہے۔ یہ بات چوں کہ سیاق کلام سے واضح ہے اس وجہ سے لفظوں میں ظاہر نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی جگہ پر یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ اس فقرہ سے بنی اسرائیل کا ان نعمتوں سے متمتع ہونا بھی واضح ہو گیا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کی کسی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ یہ آخری بات اوپر کی باتوں کی طرح یہود کو براہ راست مخاطب کر کے کہنے کے بجائے ان سے منہ پھیر کر غائب کے صیغہ سے کہی گئی ہے جس سے ان کی طرف سے متکلم کی بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۸)

"قریہ" سے مراد

قریہ کے معنی اصل لغت میں جمع ہونے کی جگہ کے ہیں۔ عربی میں کہیں گے قری الماء فی الحوض (اس نے حوض میں پانی جمع کر دیا) یہیں سے یہ لفظ بستی کے معنی میں استعمال ہوا اس لیے کہ وہ لوگوں کے مجتمع ہونے کی جگہ ہوتی ہے۔ اس لفظ کے استعمالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف چھوٹے دیہات ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ بڑے بڑے شہروں اور مرکزی آبادیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس قریہ سے یہاں مراد سرزمین فلسطین ہی کا کوئی شہر ہو سکتا ہے اس لیے کہ آگے فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا کے الفاظ سے اس کی جو تعریف وارد ہے وہ اسی سرزمین کے کسی شہر پر منطبق ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد اریحا یا یریحو ہو۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن زید کی یہی رائے ہے۔ فلسطین کے علاقہ کا یہی شہر بنی اسرائیل کے قبضہ میں سب سے پہلے آیا ہے۔

سجدہ کا مفہوم

اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا، سجدہ کے اصل معنی سر جھکانے کے ہیں۔ اس سر جھکانے کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔ اس کی کامل شکل زمین پر پیشانی رکھ دینے کی ہے جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم نے اپنے مشہور فخریہ شعر میں اس کا یہی کامل مفہوم لیا ہے۔

اذا بلغ الفطام لنا صبی تخرله الجبابر ساجدینا

(جب ہماری قوم کا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے تو بڑے بڑے جبار اس کے آگے سجدوں میں گرتے ہیں)

یہاں آیت میں اس سے مراد صرف سر جھکانا ہے۔ موقع کلام اس پر دلیل ہے۔

'الباب' سے مراد

الباب سے مراد بعض لوگوں نے بستی کا دروازہ لیا ہے، بعض لوگوں نے خیمۂ عبادت کا دروازہ، میں اس دوسرے قول کو ترجیح دیتا ہوں۔ مفتوح شہر کے دروازوں میں متواضعانہ داخل ہونے کی نصیحت بھی اگرچہ ایک قیمتی نصیحت ہے لیکن یہ نصیحت ایک ایسی قوم کے لیے موزوں ہو سکتی ہے جو بہادر اور زورآور ہو۔ بنی اسرائیل کا حال تو یہ تھا کہ جب دشت فاران میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو فلسطین پر فوج کشی کا حکم دیا ہے تو ان کے دل بیٹھ گئے اور انھوں نے صاف صاف جواب دے دیا کہ اس ملک میں جبار اور زورآور لوگ ہیں، ہم ان سے مقابلہ کے لیے تیار نہیں ہیں، تم اور تمھارا خدا دونوں جا کر لڑو، جب ان جباروں سے علاقہ خالی ہو جائے گا تو ہم داخل ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ نصیحت کچھ غیر ضروری ہی سی معلوم ہوتی ہے کہ شہر کے دروازے میں فاتحانہ تمکنت کے ساتھ نہ داخل ہوں بلکہ عاجزانہ اور سرفگندہ ہو کر داخل ہوں۔ اس وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ یہاں دروازہ سے مراد خیمۂ عبادت کا دروازہ ہے اور مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں داخل ہوں، اس کی زرخیزی اور شادابی سے پوری آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور خیمۂ عبادت میں عاجزانہ حاضر ہو کر خدا کا شکر ادا کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں، لیکن جس طرح انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری اور ہر ہدایت کی خلاف ورزی کی اسی طرح اس نعمت اور اس ہدایت کی بھی ناقدری کی۔

'حطۃ' کی تحقیق

قُوْلُوْا حِطَّةٌ : حِطۃ کا لفظ ایک جملہ کے قائم مقام ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے۔ یَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ (۸۱۔ نساء) اس وجہ سے یہاں مبتدا کو محذوف ماننا پڑے گا۔ زمخشری نے اس کی پوری وضاحت یوں کی ہے کہ مسئلتنا حطۃ (ہماری درخواست حطہ ہے)۔ حِطّۃ حَطّ سے ہے جس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں۔ یہاں مراد اس سے گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبرانی دونوں کے قریب المأخذ ہونے کے سبب سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ مادہ جھاڑ دینے اور بخش دینے ہی کے مفہوم میں عبرانی میں بھی استعمال ہوا ہے اور یہ ان کے ہاں استغفار اور توبہ کے کلمات میں سے تھا، وہیں سے یہ عربی میں منتقل ہوا۔

'احسان' کا مفہوم

مُحْسِنِیْنَ، عربی میں احسن الی فلان کے معنی ہوں گے فلاں کے ساتھ احسان کیا، اور احسن الشئی کے معنی ہوں گے اس چیز کو بہت خوبی کے ساتھ کیا۔ اس وجہ سے محسن کا لفظ عربی میں احسان کرنے والے کے لیے بھی آتا ہے اور کسی عمل کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دینے والے کے لیے بھی۔ موقع کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اردو میں اس کے لیے کوئی خوب صورت لفظ سمجھ میں نہیں آیا، اس وجہ سے ترجمہ میں صرف مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ

---

۱ ملاحظہ ہو تفسیر علامہ ابی السعود

بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۵۹)

دعا کی تبدیلی کی نوعیت

یعنی دعا کے لیے جو لفظ ان کو تلقین کیا گیا تھا اس کو انھوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل لیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں مراد الفاظ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ رویہ کی تبدیلی ہے۔ پرانوں میں سے ابو مسلم اصفہانی کا یہی خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ بَدَّلَ کا لفظ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے (جیسا کہ یہاں ہے، اگرچہ ایک محذوف ہے) تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی۔ پھر جب واضح الفاظ میں یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ ظالموں نے اس قول کو جو ان سے کہا گیا تھا ایک دوسرے قول سے بدل دیا جو ان سے نہیں کہا گیا تو اس سے صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی مراد لینا الفاظ قرآن سے صریح انحراف ہے۔

ہمارے نزدیک یہاں صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ قرآن کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے حِطَّۃٌ کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل لیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ انھوں نے کس لفظ سے اس کو بدلا تھا تو قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ اہل تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں جن میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی جزم کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنی سورہ فاتحہ کے فقروں کے مفہوم میں تبدیلی کر دی اسی طرح کی تبدیلی بنی اسرائیل نے اپنی اس دعا کے مفہوم میں کر دی۔ نصاریٰ کی فاتحہ مندرجہ توقا باب ۱۱۔ ۱ء میں یہ الفاظ جو آتے ہیں "ہماری روز کی روٹی ہمیں دیا کر" ظاہر ہے کہ اصل دعا کے مفہوم سے بالکل ہٹے ہوئے ہیں۔ اصل دعا تو یوں ہوگی کہ ہمیں وہ روح ہدایت بخش جو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے[1]۔ لیکن چوں کہ عبرانی میں روٹی کے لیے جو لفظ ہے وہ روحانی غذا اور مادی روٹی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے ہدایت کی تعبیر کے لیے یہی مشترک لفظ استعمال ہوا ہوگا۔ بعد میں ترجموں میں آکر ہدایت کی روح غائب ہو گئی، صرف روٹی بیچ رہی۔ اسی طرح کی کوئی تبدیلی بنی اسرائیل نے بھی دعا کے الفاظ میں کر دی جس سے دعا کی اصل روح بالکل بدل گئی۔

'رجز' اور 'رجس' کا مفہوم

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ: رجز اور رجس، دونوں ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ ان کا اصل مفہوم اضطراب اور ارتعاش ہے۔ یہیں سے یہ گندگی اور نجاست کے لیے استعمال ہوئے کیوں کہ گندگی اور نجاست کو دیکھ کر طبیعت میں ایک قسم کا اضطراب اور سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عذاب کے لیے استعمال ہوئے کیونکہ عذاب بھی دلوں میں ایک اضطراب اور کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ مِنَ السَّمَآءِ (آسمان سے) کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس حادثہ کی نوعیت عام حوادث سے بالکل مختلف نوعیت

---

[1] ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فاتحہ

کی تھی۔ اس میں قدرت کی غضبناکی کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ تورات کے بعض مقامات میں اس مخصوص نوعیت کی یوں وضاحت کی گئی ہے:۔

اگر یہ آدمی ویسے ہی موت سے مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثے گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو اس کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ (گنتی باب ۱۶: ۲۹-۳۰)

قرآن نے مذکورہ عذاب کی اس مخصوص نوعیت کو مِنَ السَّمَاءِ کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ جس طرح ہم کسی ہولناک آفت کو قہرِ آسمانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ یہ عذاب کیا تھا تو خاص اس قریہ سے متعلق جس کا یہاں ذکر ہے، اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ البتہ تورات کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس سفر کے دوران میں متعدد بار بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی شدید نافرمانیاں کیں اور ان نافرمانیوں کی پاداش میں وہ مختلف وباؤں کے شکار ہوئے۔ مثلاً جس زمانہ میں بنی اسرائیل شطیم میں (جو ارضِ فلسطین کے بالکل پاس کا ایک شہر تھا) تھے تو ان لوگوں نے موآبی عورتوں کے ساتھ بدکاریاں کیں، ان کی دعوت پر یہ لوگ ان کی مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہونے لگے اور اس طرح بالواسطہ ان کے دیوتا بعل فغور کی پرستش شروع کر دی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں ان کے چوبیس ہزار نفوس ہلاک ہوئے۔

کتابِ گنتی کے باب ۳۳ میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موآب کے میدانوں میں بنی اسرائیل کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہونا تو تم یہاں کے سب مشرکوں کو نکال دینا، ان کے شبیہ دار پتھروں اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے اونچے مقامات کو مسمار کر دینا مگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھو کہ جیسا میں نے تم کو ان کے ساتھ کرنے کے لیے کہا ہے ویسا ہی میں تمہارے ساتھ کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق پیغمبر کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں ان پر اسی قسم کی کوئی وبا آئی جس قسم کی وبا ان پر شطیم میں آئی تھی۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (۶۰)

پانی کے لیے موسیٰ کی دعا

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کے لیے یہ دعا دشت صین میں کی ہے۔ کتاب گنتی باب ۲۰ میں ہے:۔

"اور پہلے مہینہ میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشت صین میں آ گئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے .... اور جماعت کے لوگوں کے لیے وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خلاف اکٹھے ہوئے اور لوگ موسیٰ سے

جھگڑنے اور یہ کہنے لگے کاش ہم بھی اس وقت مر جاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اس بری جگہ پہنچایا ہے۔ یہ تو بونے کی اور انجیروں کی اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو پینے کے لیے پانی تک میسّر نہیں اور موسیٰؑ اور ہارونؑ جماعت کے پاس سے جا کر خیمہ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے۔ تب خداوند کا جلال ان کے اوپر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ اس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارونؑ تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو ان کے لیے چٹان ہی سے پانی نکالنا یوں جماعت کو اور ان کے چوپایوں کو پلانا۔ چنانچہ موسیٰؑ نے خداوند کے حضور سے اسی کے حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰؑ اور ہارونؑ نے جماعت کو اس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اس نے ان سے کہا سنو اے باغیو! کیا ہم تمھارے لیے اس چٹان سے پانی نکالیں۔ تب موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہہ نکلا اور جماعت نے اور ان کے چوپایوں نے پیا (گنتی باب ۲۰: ۱-۱۲)

ہر قبیلے کے لیے الگ الگ گھاٹ

قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ: قَدْ عَلِمَ یعنی جان لیا، متعین کر لیا۔ چونکہ پہاڑی سے بارہ چشمے پھوٹے تھے اور بنی اسرائیل کے خاندان بھی بارہ ہی تھے اس وجہ سے ہر خاندان نے اپنے اپنے گھاٹ الگ الگ متعین کر لیے اور اس چیز کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ پانی کے لینے پر کوئی جھگڑا برپا ہو۔ اگر اس بہتات کے ساتھ پانی کا انتظام نہ ہوا ہوتا تو اس صحرا میں ان لوگوں کے اندر روز پانی پینے پلانے ہی پر تلواریں کھنچی رہتیں۔ اس وجہ سے یہ واقعہ صرف ایک عظیم معجزہ ہی نہیں بلکہ ایک عظیم احسان بھی تھا۔

نعمت کا حق

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا .... الآیہ: جس طرح مَن و سلویٰ کی نعمت کے ذکر کے بعد آیت ۵۷ میں فرمایا، كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے بخشی ہیں کھاؤ) اسی طرح اس پانی کے انتظام کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا، كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور زمین میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھیلو) یہ اس عظیم نعمت کا حق بیان ہوا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت جو ہمیں حاصل ہوتی ہے زبانِ حال سے ہمیں اس حق کی یاددہانی بھی کرتی ہے جو اس سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔ یہ اس حق کی تعبیر ہے اور انسان کی فطرت اگر کفرانِ نعمت کی سیاہی سے مسخ نہ ہو چکی ہو تو وہ اس حق سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہی کی صدا ہے جو وحی الٰہی اس کے کانوں کو سنا رہی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنے کا ہے کہ مَن و سلویٰ کے ذکر کے بعد صرف كُلُوْا (کھاؤ) کا لفظ وارد ہوا ہے اس لیے کہ اس وقت تک بہتات کے ساتھ صرف غذا کا اہتمام فرمایا تھا۔ جب اسی بہتات اور فراوانی کے ساتھ پانی کا بھی انتظام فرما دیا تو كُلُوْا کے ساتھ وَاشْرَبُوْا (اور پیو) کا بھی اضافہ کر دیا۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (۶۱)

بقل کا مفہوم

بقل کا لفظ سبزیوں اور ترکاریوں کے تمام اقسام کے لیے عام ہے۔

قثاء کا مفہوم

قثاء کے معنی ککڑی اور کھیرے کے ہیں۔

فوم اور ثوم کا مفہوم

فوم اور ثوم ایک ہی چیز ہے۔ اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ اہل عرب ث کو کبھی کبھی ف سے بدل دیا کرتے ہیں مثلاً عاثور کو عافور اور اثافی کو اثاثی کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں بقوم کا لفظ بھی یہیں سے چلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لہسن کے لیے یہ لفظ اس قدر مشہور ہے کہ اس سے روٹی یا گندم یا غلہ وغیرہ مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید کی تاویل ہمیشہ الفاظ کے مشہور معانی کے لحاظ سے کرنی چاہیے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے جس مطالبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا ذکر تورات کی کتاب گنتی کے باب ۱۱ میں اس طرح ہے۔

"اور جو ملی جلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی وہ طرح طرح کی حرص کرنے لگی اور بنی اسرائیل بھی پھر رونے اور کہنے لگے کہ ہم کو کون گوشت کھانے کو دے گا۔ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مصر میں مفت کھاتے تھے اور ہائے وہ کھیرے اور خربوزے اور وہ گندنے اور پیاز اور لہسن لیکن اب تو ہماری جان خشک ہو گئی۔ یہاں کوئی چیز میسر نہیں اور من کے سوا ہم کو اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" (۴-۷)

بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی کی ایک مثال

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ، "ادنیٰ" دناوت سے ہے، یعنی کیا تم ایک اعلیٰ غذا کو ایک ادنیٰ اور گھٹیا غذا سے بدلنا چاہتے ہو۔ یہ من و سلویٰ کی غذا تمھارے لیے تمھارے پروردگار نے مہیا فرمائی ہے اور تمھیں اس صحرا میں اس حالت میں مل رہی ہے کہ تم فرعونیوں کی غلامی اور شرک و کفر کی اطاعت کی ذلت سے بالکل آزاد ہو، روکھی پھیکی غذا جو آزادی کے ساتھ نصیب ہو رہی ہے غلامی اور ذلت کے حلوے سے ہزار درجہ بڑھ کر ہے لیکن یہ تمھاری بدقسمتی ہے کہ تم چٹخاروں کے لیے رسیا ہو کہ ان کے پیچھے تمھاری نگاہوں میں اس آزادی کی بھی، جس میں خدا کے سوا تمھارے اوپر کسی کی حکومت باقی نہیں رہی ہے، کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے اس رویہ میں ان مسلمان قوموں کے لیے ایک بہت بڑا درس عبرت ہے جنھوں نے تمدن کے لوازم و تنوعات کے پیچھے اپنی آزادی کی نعمت خطرے میں ڈال دی اور اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ اس طرح جو لذائذ دنیا انھوں نے حاصل کیے ہیں ان کے ساتھ ذلت کے کتنے گھناؤنے مفاسد چپکے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید

کہ اس مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان کا ضمیر زندہ ہو تو وہ کھانے کی لذت دسترخوان کے تنوعات کے اندر نہیں ڈھونڈھتا بلکہ ضمیر اور ارادہ کی آزادی کے اندر ڈھونڈھتا ہے۔ یہ چیز اگر اس کو حاصل ہو تو خشک روٹی بھی اس کے لیے جملہ الوانِ نعمت فراہم کر دیتی ہے۔

'مصر' سے مراد

اِهْبِطُوْا مِصْرًا: 'ہبط' کے اصل معنی گرنے کے ہیں اور استعمال میں یہ کسی مسافر کے کسی منزل میں اترنے کے لیے بھی آتا ہے مثلاً کہیں گے ھبطنا الوادی (ہم وادی میں داخل ہوئے) یہیں سے اھبطوا مصرًا کا محاورہ رائج ہوا اور ھبوط کا لفظ نزول کے مرادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس استعمال کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ مسافر جب کسی مقام پر قیام کا ارادہ کرتا ہے تو وہاں وہ اپنے مرکب سے اترتا ہے۔

اس خاص موقع پر اس لفظ میں یہ موزونیت بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے جن چیزوں کا مطالبہ کیا تھا وہ کسی ہموار نشیبی اور زرخیز علاقہ ہی میں مل سکتی تھیں۔

مصرًا سے مراد کوئی شہر ہے۔ اس سے ملک مصر مراد نہیں ہو سکتا۔ مصر، ملک مصر کے لیے قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے لیکن ہر جگہ غیر منصرف آیا ہے۔ صرف اس آیت میں یہ منصرف کی صورت میں آیا ہے۔ اس وجہ سے لازماً یہ شہر کے عام مفہوم میں آیا ہے۔ البتہ شہر کے لیے خاص طور پر یہاں مصر کے لفظ کے استعمال میں بلاغت کا یہ پہلو ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ سے ان کو وہ ذلتیں اور مصیبتیں یاد دلائی گئی ہوں جن میں وہ مصر میں مبتلا رہ چکے تھے اور مقصود اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر تم ان چٹخاروں کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے تو ان کے لیے تو تمہیں کسی مصر ہی کے شکنجہ میں اپنی گردن دینی پڑے گی۔ اس لیے کہ جو قوم کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے اپنے اندر صبر و استقامت نہیں پیدا کر سکتی وہ اپنے آپ کو ذلت سے نہیں بچا سکتی۔

'مسکنت' کا مفہوم

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ: مسکنت کے معنی عجز و بے بسی، پست ہمتی اور بدحالی کے ہیں۔ اُن کے اوپر ذلت اور پست ہمتی ماردی گئی کی تعبیر اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ جس طرح دیوار پر گیلی مٹی تھوپ دی جاتی ہے اسی طرح ان کی مسلسل ناشکریوں اور آیاتِ الٰہی کی ناقدریوں کے سبب سے ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے نہایت ہی نرم چارہ بن کر رہ گئے، حالات و خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی عزم و حوصلہ باقی نہ رہا۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو مواقع اس لیے فراہم کیے کہ وہ ان سے سرخروئی اور فائز المرامی حاصل کریں اپنی پست ہمتی اور نالائقی کے سبب سے وہ وہاں سے خدا کی لعنت اور پھٹکار لے کر لوٹے۔

یہود کی ذلت کا سبب

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ ..... ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: یہ ان کے اوپر ذلت اور مسکنت کے تھوپے جانے کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کے کسی ایک ہی گناہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کی پوری تاریخ سرمستیوں اور نافرمانیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ اپنی سرکشی اور تعدی کی فطرت کے سبب سے برابر اللہ کی آیتوں کا انکار اور اس کے نبیوں

کو قتل کرتے رہے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا یہ زعم کہ یہ خدا کے بڑے چہیتے اور محبوب ہیں اور کوئی ان کو ان کے اس مقام سے کھسکا نہیں سکتا ایک بالکل بے بنیاد گھمنڈ ہے، یہ تو اپنی کرتوتوں کے سبب سے خدا کی درگاہ سے راندے ہوئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام میں سے جن جن کا یہود کے ہاتھوں قتل ہونا خود یہود کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ان میں سب سے پہلا نام تو حضرت زکریا علیہ السلام کا ہے جن کو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے عین ہیکل میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام ملتا ہے جن کو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے حکم سے قتل کیا گیا اور ان کا سر بادشاہ نے ایک تھال میں رکھ کر اپنی معشوقہ کو نذر کیا۔

پھر سیدنا مسیح علیہ السلام کا نام آتا ہے جن کو یہود نے اپنے زعم کے مطابق سولی پر لٹکوایا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؑ کو ان کے شر سے بچا لیا۔

یہاں انبیاء علیہم السلام کے قتل کے ذکر کے ساتھ بغیر الحق (ناحق) کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ اس سے مقصود ان کے اس جرم کی سنگینی کو واضح کرنا ہے۔ اس لیے کہ قتل نفس بجائے خود انسانی معاشرے کا سب سے بڑا جرم ہے۔ یہ جرم مزید سنگین ہو جاتا ہے اگر اس کا ارتکاب انبیاء و مصلحین کے خلاف کیا جائے پھر اس کی سنگینی میں مزید اضافہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب بغیر کسی وجہ جواز کے کیا جائے۔ یہاں قرآن نے یہود کے اس جرم میں تمام سنگینیاں جمع کر دی ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۶۲)

لفظ 'یہود' کی تحقیق

هاد، یهود، هودا کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے، وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ ۱۵۶ اعراف (اور ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دے۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا) پھر یہ اور ہُوْدٌ یہودی ہونے کے معنی میں استعمال ہوئے اور یہ استعمال عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق ہے، جس طرح تَنَصَّرَ نصرانی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اس لفظ کی اصل حقیقت یہی ہے لیکن بعض مخالفین اسلام نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ قرآن نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہود کا لفظ ہود کے مادہ سے نہیں ہے بلکہ یہ یہوذا کی طرف نسبت ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے تھے۔ اس اعتراض کے سبب سے اس لفظ کی تحقیق ضروری ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں اس لفظ کی جو تحقیق بیان کی ہے ہم اس کے ضروری حصہ کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔ مولانا اس لفظ کے اشتقاق پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہم یہاں اس لفظ کے اشتقاق پر گفتگو کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کے خلاف یہ اعتراض اٹھایا ہے انھوں نے نہ تو قرآن مجید ہی کو سمجھا ہے اور نہ خود اپنے صحیفوں ہی کو سمجھا ہے۔ قرآن مجید نے یہ لفظ جو استعمال کیا ہے تو اپنی طرف سے ایجاد کر کے نہیں کیا ہے بلکہ عربی زبان کے ایک عام استعمال کردہ لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اہل عرب یا د یہود کا فعل یہودی ہونے کے معنی میں استعمال کرتے آئے ہیں اور قرآن مجید نے ھُدْنَا کا لفظ جو استعمال کیا ہے تو لفظ یہود کا اشتقاق بیان کرنے کے لیے نہیں کیا ہے بلکہ یہ لفظ اپنے اصل معنی یعنی توبہ کرنے اور رجوع کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خاص اس لفظ کے استعمال میں بلاغت کا ایک نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ یہ یہود کو ایک ایسی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہا ہے جس کو وہ بالکل فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔"

"اس اعتراض سے انھوں نے خود اپنے صحیفوں سے جس بے خبری کا ثبوت دیا ہے اس کی حقیقت اس تفصیل سے واضح ہوگی جو ہم آگے پیش کر رہے ہیں:

"یہوذا حضرت یعقوب علیہ السلام کے ان بارہ بیٹوں میں سے چوتھے بیٹے تھے جن سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں کا ظہور ہوا ہے۔ یشوع کے زمانہ میں مفتوحہ علاقہ انھی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوا اور اس تقسیم میں ارشلیم سے لے کر اس کے جنوب کا تمام علاقہ بنی یہوذا کے حصہ میں آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسی خاندان سے تھے۔ ان کے زمانہ میں تمام سلطنت بنی اسرائیل ان کے قبضہ میں آئی جس سے اس خاندان کی عظمت و شوکت کو چار چاند لگ گئے۔ ان کے بعد ان کے وارث اُن کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے جنھوں نے اپنے دارالسلطنت میں ہیکل کی تعمیر کی۔ اس سے بنی یہوذا کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔"

"حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے اندر اختلافات پیدا ہوئے اور یہ پوری قوم دو حصّوں میں بٹ گئی۔ ایک حصّہ یہوذا کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا بنی اسرائیل کے۔ بقیہ خاندانوں کے نام اس کے بعد بالکل غیر معروف ہو کر رہ گئے۔ بعد کی تاریخ میں یہوذا اور اسرائیل دو ہی نام آتے ہیں۔ پھر جب یہ لوگ کلدانیوں کی اسیری میں مبتلا ہوئے ہیں تو تمام بنی اسرائیل کے لیے یہود کا لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یہوذا اور یہود میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔"

"لفظ یہوذا کے اشتقاق میں یہود کو بڑا اشتباہ پیش آیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لفظ یہوا اور ذا سے مرکب ہے۔ یہو کے معنی اللہ کے اور ذا کے معنی ہذا کے ہیں۔ چوں کہ اس طرح یہو کے ساتھ ترکیب پائے ہوئے نام ان کے ہاں موجود ہیں اس وجہ سے ان کو یہ غلط فہمی پیش آئی اور یہوذا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کتاب پیدائش میں جو عبارت موجود ہے اس کو یہ لوگ نہ سمجھ سکے۔ سفر تکوین کی عبارت

یہ ہے۔

اور وہ (لیہ زوجہ یعقوب علیہ السلام) پھر حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا۔ تب اس نے کہا کہ میں اب خداوند کی ستائش کروں گی۔ اس لیے اس کا نام یہوذا رکھا۔ (پیدائش باب ۲۹ آیت ۳۵)

اس سے یہود نے یہ سمجھا کہ یہ لفظ اس واقعہ اور یہود کے لفظ کی طرف اشارہ کر رہا ہے حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی حمد کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ الفاظ اس تاویل کے متحمل ہیں، اور مندرجہ ذیل امور اس کی تائید میں ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کے ناموں کے معانی کی طرف جس طرح ان کی ولادت کے ذکر کے سلسلہ میں اشارہ ہوا ہے اسی طرح اس موقع پر بھی اشارہ ہوا ہے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے لیے برکت کی دعا فرمائی ہے۔ مثلاً ولادت کے بیان کے سلسلہ میں کتاب پیدائش باب ۳۰ آیت ۱۹۔۲۰ میں ہے۔

اور لیاہ پھر حاملہ ہوئی اور یعقوب سے اس کے چھٹا بیٹا ہوا۔ تب لیاہ نے کہا کہ خدا نے مجھے اچھا مہر بخشا۔ اب میرا شوہر میرے ساتھ رہے گا کیونکہ میرے اس سے چھ بیٹے ہو چکے ہیں سو اس نے اس کا نام زبولون رکھا۔

پھر اسی کتاب میں دعائے برکت کے سلسلہ میں یہ الفاظ وارد ہیں۔

زبولون سمندر کے کنارے بسے گا ۴۹/۱۳

غور کر کے دیکھو، ان دونوں مواقع پر سکونت کے معنی کی طرف اشارہ موجود ہے۔

اسی طرح یہوذا کے متعلق اس کتاب میں جو دعا مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اے یہوداہ! تیرے بھائی تیری مدح کریں گے۔

تیرا ہاتھ تیرے دشمنوں کی گردن پر ہوگا۔

تیرے باپ کی اولاد تیرے آگے سرنگوں ہوگی۔

اس سے واضح ہوا کہ یہودا کے تسمیہ میں درحقیقت حمد و طاعت کا مفہوم ملحوظ ہے۔ اور لفظ یہوذا یہو اور ذا سے مرکب نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی لفظ ہے اور اس کا مادہ ہود ہے۔

دوسرا یہ کہ کلدانیوں کی اسیری کے بعد سے ان کے لیے مشترک طور پر جو نام استعمال ہوا ہے وہ یہود اور یہودی کا ہے۔ اس کے ثبوت عزرا، نحمیا، استیر، اشعیا، ارمیا، دانیال اور انجیل سب میں موجود ہیں یہاں تک کہ یہی نام زبان زد عوام و خواص ہو گیا۔ اگر اصل نام یہوذا ہوتا، جیسا کہ ان لوگوں کا دعویٰ ہے تو پھر اس کی طرف نسبت یہوذی (ذال کے ساتھ) ہونی چاہیے تھی نہ کہ دال کے ساتھ۔

تیسرا یہ کہ لفظ یہو کے ساتھ کسی ایسے ہی لفظ کو ملایا جا سکتا ہے جس کا ملایا جانا اس کے ساتھ موزوں ہو۔ لفظ ذا کوئی ایسا موزوں لفظ نہیں ہے جو کسی مخلوق کا نام رکھنے کے لیے اس کے ساتھ ملایا جائے کیوں کہ اس کے ملانے سے جو معنی بنتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مخلوق کے لیے اس لفظ کا استعمال

ایک نہایت ہی مکروہ سی بات ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن مجید نے یہاں اپنے عام قاعدے کے مطابق یہود کو ان کی ایک غلطی پر متنبہ کیا اور یہ واضح کیا ہے کہ لفظ یہود جس کی طرف وہ اپنے کو منسوب کرتے ہیں اس کی اصل مادہ ہود سے ہے اور اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان کے نام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔[1]

لفظ نصاریٰ کی تحقیق

نصاریٰ، لفظ نصاریٰ کی تحقیق استاذ امام رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں مندرجہ ذیل بیان فرمائی ہے:۔

نصاریٰ نصران کی جمع ہے جس طرح ندامیٰ ندمان کی جمع ہے۔ شروع شروع میں نصاریٰ کا یہی نام تھا اور ان کے متقدمین اس نام کو پسند کرتے تھے لیکن متاخرین نے اپنے متقدمین کے برخلاف اس کو اپنی تحقیر سمجھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نصاریٰ بعد کے دور میں دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقہ نے خلیفہ برحق شمعون (پطرس) کی پیروی کی، اس نے اپنے آپ کو نصاریٰ سے موسوم کیا۔ اس گروہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے۔ یہی گروہ ہے جس کی قرآن نے مختلف مقامات میں تعریف فرمائی ہے۔ مثلاً وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۸۲ - مائدہ (اور تم اہلِ ایمان کی دوستی میں ان لوگوں کو زیادہ قریب پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو نصاریٰ کہا) اس آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ قرآن کا ممدوح گروہ وہی ہے جس نے اپنے آپ کو نصاریٰ سے موسوم کیا۔

ان کے دوسرے فرقہ نے مبتدع بولس (پال) کی پیروی کی، موجودہ عیسائی اسی فرقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں ان لوگوں کے نزدیک نصاریٰ کا لفظ ایک تحقیر کا لفظ ہے۔ ان کے خیال میں یہ ایک گاؤں کی طرف نسبت ہے جو ایک نہایت حقیر سا گاؤں تھا، چناں چہ یوحنا باب ۱ میں ہے:۔

"فلپس نے نتن ایل سے مل کر ان سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے وہ ہم کو مل گیا، وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔ نتن ایل نے اس سے کہا، کیا ناصرہ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے۔" یہ بات اس گروہ کے تکبر کی ایک دلیل ہے۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کا مولد ناصرہ ہی ہے تو اس کی طرف منسوب ہونے میں حقارت کا کون سا پہلو ہے۔ جب کہ ان لوگوں کا دعویٰ بھی ہے کہ ناصرہ حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش ہے اور یہ کہ وہ ناصری کے لقب سے پکارے جائیں گے۔ چناں چہ متی باب ۲۰۴ میں ہے:۔

---

[1] اس تمام تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن میں تحقیق لفظ "هَادُوْا"